پیاسے کو شبنم
محی الدین نواب

محی الدین نواب کے قلم سے محبت میں ڈوبے ہوئے دو دِلوں کی داستان

محی الدین نواب

الرفاعی پبلشرز اینڈ بک سیلرز
چوک میو ہسپتال نسبت روڈ لاہور

بار اول ــــ ۲۰۰۱ء
مَطبع ــــ یُو اینڈ می پرنٹرز لاہور
قیمت ــــ -/۱۲۵ روپے

اسٹاکسٹ:۔
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ' اُردو بازار
لاہور۔فون: ۷۲۴۷۴۱۴

تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اقبال...

لڑکیاں بہت سے نازک جذبوں کو اور بہت سی کھٹی
میٹھی عادتوں کو بڑے جتن سے چھپا کر رکھتی ہیں۔ توبہ ہے'
یہ مرد بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ کیسے کیسے حربوں سے
کھنگال کر رکھ دیتے ہیں۔

ریشمی پردوں کے پیچھے ایک ایسی ریشمی جنت تھی جو خوابوں کو چھو کر دل میں بیٹھ جاتی ہے اور ہمہ وقت تعبیر کے لیے للچاتی رہتی ہے۔

عزت آراء ریشمی پردوں سے چپک کر رہ گئی۔ نہ دہلیز کے اِدھر آ سکی' نہ اُدھر جا سکی۔ بعض اوقات لڑکیاں خواب اور حقیقت کے درمیان اس طرح ساکت و جامد ہو جاتی ہیں' جو نظارہ سامنے ہوتا ہے وہ سارے کا سارا بیک وقت نظروں میں نہیں سماتا۔ وہ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ ڈرائنگ روم بھی ایسا ہی تھا۔ حیران حیران سی آنکھوں میں بیک وقت نہیں سما سکتا تھا۔ اسی لئے عزت دہلیز پر ٹھہر گئی تھی' لمحہ بھر کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ صرف اس کی سیاہ آنکھوں کی پتلیاں نظارہ نظارہ بھٹک رہی تھیں۔

سامنے والی دیوار پر ایک بہت بڑا فش ایکوریم تھا۔ سرخ و سنہری مچھلیاں' فیروزی و روپہلی مچھلیاں' چاندی کی طرح چمکتی ہوئی' سونے کی طرح دمکتی ہوئی اور رنگوں کی قوس قزح بچھاتی ہوئی اِدھر سے اُدھر تیر رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے کترا رہی تھیں اور بل کھا کھا کر اپنا رخ بدلتی جا رہی تھیں۔

ایکوریم کے نیلے پانی کا جھلملاتا ہوا عکس' دو صوفوں تک آ رہا تھا اور وہاں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے چہروں پر بڑی شوخی سے تھرک رہا تھا۔

"مس کم ان۔" ایک لڑکی نے کہا۔ "شاید آپ بھی ملازمت کے لیے آئی ہیں؟"

عزت چونک کر جاگتی دنیا میں آ گئی۔

وہ یہاں ملازمت کرنے آئی تھی' خواب دیکھنے نہیں آئی تھی۔ کیا مصیبت ہے' اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے' سوچ کی لہریں ہمیشہ بہا کر لے جاتی ہیں۔ خود اس نے اپنی ایک کہانی میں ایسی ہی ایک بات لکھی تھی کہ لڑکیوں کے دماغ میں سوچ کی لہریں نہ ہوں اور آنکھوں میں خوابوں کا خمار نہ ہو تو پھر وہ لڑکیاں نہیں رہتیں۔ حالات کے دھاگوں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں بن کر رہ جاتی ہیں۔

وہ صوفوں کی طرف جانے لگی۔ پاؤں کے نیچے قالین اتنے دبیز اور ملائم تھے کہ اس کی چال آپ ہی آپ بدل گئی۔

چال بدلنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چلن بدل جاتا ہے۔ یہ تو وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ پاؤں میں پازیب ہو تو سہمی اور لجائی ہوئی مشرقیت آ جاتی ہے۔ اونچی ایڑی کے سینڈل ہوں تو لچکتی ہوئی بے باک مغربیت پیدا ہو جاتی ہے اور قدموں تلے خوابوں کی قالین بچھتی چلی جائے تو چال میں ایکوریم کی بل کھاتی ہوئی مچھلیوں کا سا لوچ اور نزاکت آ جاتی ہے۔

وہ بل کھا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس کے آس پاس جتنی لڑکیاں تھیں انہوں نے چیختے ہوئے رنگوں کا لباس پہنا تھا۔ سب ہی انٹرویو کے لیے آئی تھیں۔ انٹرویو کے دوران ان کی زبان جو بولتی سو بولتی مگر ان کا لباس اور اس کی سجاوٹ بہت کچھ بول رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر یہ خیال آتا تھا کہ وہ ملازمت حاصل کرنے کی بجائے اپنا رشتہ طے کرنے آئی ہیں۔

انہوں نے عزت کی جانب تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ اس لڑکی میں کچھ بھی تو نہ تھا۔ اُجلا اُجلا سا دھلا ہوا چہرہ تھا۔ کالی کالی سی نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں تھیں۔ پتہ نہیں ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی ہلکی لالی تھی یا ان لبوں کی رنگت ہی گلابی تھی۔ لڑکیاں فیصلہ نہ کر سکیں۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی گئیں کہ اس لڑکی کو میدان جیتنے کا سلیقہ نہیں آتا ہے جبھی تو اتنی بڑی ملازمت حاصل کرنے کے لیے سفید کفن جیسا لباس پہن کر آئی ہے۔

سفید ململ کی شلوار' سفید ململ کی قمیض۔ سیدھی سادی تراش تھی۔ فیشن کا ہیر پھیر نہیں تھا۔ دوپٹہ سر پر سے ہوتا ہوا سینے اور شانوں کے اطراف اس طرح لپٹا ہوا تھا جیسے سانپ جسم کے خزانے پر کنڈلی مار کر بیٹھا ہو۔ اس لڑکی میں کچھ بھی نہ تھا' پھر بھی اسے جی بھر کر دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔

ایک لڑکی نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"میرا نام ناصرہ پروین ہے۔ میں آپ کو پہچانتی ہوں۔ آپ روزنامہ "آہنگ" میں خواتین کے صفحات کی انچارج رہ چکی ہیں نا؟"

"جی ہاں!"

"آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ صرف "بہت اچھا" میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ آپ کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔"

عزت نے مسکرا کر کہا۔ "آپ نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ میری صلاحیتوں سے زیادہ آپ نے تعریف کی ہے۔"

ایک لڑکی نے حیرت سے کہا۔ "او آئی جسٹ ریممبر۔ میں نے ماہنامہ "خاتون" میں آپ کی تصویر دیکھی ہے۔ آپ جتنی خوبصورت کہانیاں لکھتی ہیں اتنے ہی خوبصورت اور گرما گرم اسکینڈل آپ کے متعلق سننے میں آئے ہیں۔"

عزت بجھ کر رہ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس لڑکی نے اسے بہت بڑی گالی دی ہو۔

ناصرہ نے اس لڑکی کو ناگواری سے دیکھ کر کہا۔ "لوگوں کا کیا ہے وہ تو اچھی لڑکیوں کو بھی بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کے اسکینڈل تراش لیتے ہیں۔"

لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو کیا ہوا؟ بدنام ہونے سے کیا نام نہیں ہوتا؟ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ جو لڑکی جتنی زیادہ بدنام ہوتی ہے اتنی ہی جلدی اسے ہر جگہ ملازمت مل جاتی ہے۔"

"یو آر رائٹ۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔"

دوسری لڑکی نے زبان سے ہونٹوں کی سرخی کو ذرا سا تر کیا' چمکایا' اسے جلا دی پھر کہا۔

"ہمیں ملازمت دینے والے مرد ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کس پر مہربان ہونا چاہئے' میں تو اتنا جانتی ہوں کہ عورت کہیں بھی جائے۔ سیل کاؤنٹر کے پیچھے رہے' سہاگ کی سیج پر جائے یا ملازمت کی کرسی پر بیٹھے اسے ایک بھڑکیلے اشتہار کی طرح بن سنور کر رہنا پڑتا ہے۔"

ناصرہ پروین نے غصے سے کہا۔ "آئی ڈونٹ ایگری۔ آپ یہ کہہ کر عورت کی توہین کر رہی ہیں۔ عمدہ لباس پہننے اور اشتہار بن جانے میں بڑا فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غلط لوگوں سے آپ کا سابقہ پڑا ہو۔ شاید اسی لئے آج بھی آپ اشتہار بن کر آئی ہیں۔ لیکن بہن! تمام ادارے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ابھی کچھ ادارے ایسے ہیں جہاں ہم عزت آبرو سے ملازمت کر سکتی ہیں۔"

عزت نے ناصرہ کو پسندیدگی سے دیکھا اور کہا۔ "ہم سب قلمکار ہیں۔ ہم نے ایک معزز پیشے کو اپنایا ہے۔ اگر ہم نے اس پیشے کے وقار کو برقرار نہ رکھا تو پھر ہمیں واپس گھر کی چاردیواری میں جا کر بیٹھنا پڑے گا اور ہم گھر کی چاردیواری میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتیں۔ کوئی تو مجبوری ہے کہ ہم باہر آ کر ٹھوکریں کھاتے اور بار بار سنبھلنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔"

ایک لڑکی نے صوفہ پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "واقعی ابھی کچھ ادارے ایسے ہیں' جہاں ہم عزت آبرو سے ملازمت کر سکتی ہیں۔ میں ناصرہ صاحبہ کی باتوں سے متفق ہوں۔ میرا نام فرزانہ تبسم ہے۔ میرے خاوند نے خوب سوچ سمجھ کر مجھے یہاں ملازمت کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ نواز صاحب کو ذاتی طور پر جانتے ہیں...."

نواز صاحب!

نواز صاحب کا نام سن کر عزت کی نگاہیں اس ڈرائنگ روم کی دلنواز سجاوٹ پر بھٹکنے لگیں۔ اس خوبصورت کوٹھی کے مالک نواز احمد درانی تھے۔

مکیں اپنے مکان کی شان و شوکت سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ وہ کوئی خاندانی رئیس نہیں تھے۔ جو کچھ انہوں نے حاصل کیا تھا' وہ ان کی محنت اور مسلسل جدوجہد کا انعام تھا۔

وہ ایک کامیاب پبلشر تھے۔ انہوں نے اپنے ادارے سے سینکڑوں کتابیں شائع کی تھیں۔ ماہانہ لاکھوں روپے کی آمدنی تھی۔ کوٹھی' کار' بینک بیلنس سب کچھ تھا۔ مگر اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ تنہا تھے۔ رشتہ داروں سے دور کی صاحب سلامت رکھتے تھے۔ کتابوں سے ایسا عشق تھا کہ کسی حسین چہرے سے دل لگانے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی اور نہ ہی آئندہ ایسی توقع تھی کہ وہ شادی کرنے اور اس کوٹھی کی رونق بڑھانے کے متعلق کبھی سنجیدگی سے غور کریں گے۔

ان کے دوستوں کا کہنا تھا کہ ان کے سینے میں دل نہیں ہے۔ دل کی جگہ بھی ایک کتاب رکھی ہوئی ہے۔ دھڑکنے کی بجائے اس کے اوراق پھڑپھڑاتے رہتے ہیں۔ دوستوں نے جب بہت زور دیا' بہت ہی اصرار کیا کہ کسی اچھی لڑکی کو اپنی عزت بنا کر گھر لے آئیں تو انہوں نے مجبور ہو کر ماہنامہ "عزت" کی اشاعت کا پروگرام بنا لیا۔

ناصرہ پروین نے مسکرا کر عزت کو دیکھا اور بڑے خلوص سے کہا۔ "ماہنامہ عزت کی مدیرہ عزت آراء۔ دیکھئے آپ کا نام رسالے کے نام سے کتنا میچ ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں آپ ہی کو اس رسالے کی مدیرہ ہونا چاہئے۔"

عزت نے مسکرا کر کہا۔ "میں یہی امید لے کر آئی ہوں۔"

"ہم سب اُمیدوار ہیں۔" ایک لڑکی نے کہا۔ "مگر ناصرہ صاحبہ انتخاب سے پہلے ہی آپ کے حق میں واک آؤٹ ہو رہی ہیں۔"

دوسری لڑکی نے پوچھا۔ "بھئی ناصرہ صاحبہ کی یہ مہربانی ہماری سمجھ میں نہیں آئی؟؟"

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے۔" ناصرہ نے جواب دیا۔ "اس رسالے میں مدیرہ کے علاوہ اور بھی تو پوسٹ ہیں۔ میں ان کے لئے ٹرائی کروں گی چونکہ عزت صاحبہ مجھ سے زیادہ باصلاحیت اور سینئر ہیں۔ اس لئے میں خیال ظاہر کر رہی ہوں کہ انہیں مدیرہ ہونا چاہئے۔"

اتنے میں ایک ملازم چائے اور ناشتہ کی ٹرالی لے کر آیا۔

ایک لڑکی نے پوچھا۔ "کیا ابھی تمہارے صاحب سو کر نہیں اٹھے ہیں؟"

"جی ہاں اٹھ گئے ہیں۔ ان کے حکم سے میں ناشتہ لے کر آیا ہوں۔" ملازم جواب دے کر چلا گیا۔

ایک لڑکی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "یہ مہمان نوازی سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم تو انٹرویو کے لیے آئی ہیں۔"

"انٹرویو کے لیے دفتروں میں بلایا جاتا ہے مگر ہم یہاں کال کی گئی ہیں کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے؟"

فرزانہ فہیم نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ نواز صاحب علیل ہیں۔ دفتر نہیں جا سکتے تھے۔ اسی لئے شاید ہمیں یہاں بلایا گیا ہے۔"

ایک نے سینڈوچ کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ان مردوں کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ یہ بظاہر عورت سے بیزار نظر آتے ہیں مگر خواتین کے لیے رسالے کا اجراء کرتے ہیں۔ علالت کے بہانے گھر بلا کر مہمان نوازی کرتے ہیں اور نظروں سے دور رہ کر اپنی شخصیت کا رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نواز صاحب کے متعلق میری یہی

ریڈنگ ہے۔"

ناصرہ ان کے لیے چائے بناتی ہوئی کہنے لگی۔ "میرا خیال ہے کہ اس مہمان نوازی کے ذریعے ہمارے انتظار کی بوریت دور کی جا رہی ہے۔"

عزت نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "ہم عورتیں کسی طرح مطمئن نہیں ہوتیں۔ اگر ہماری عزت افزائی نہ کی جائے تو ہم ناقدری کی شکایتیں کرتی ہیں اور اگر قدر دانی کے لیے کوئی چائے کی پیالی پیش کرے تو ہم اس چائے کی مٹھاس میں اپنے شک و شبہات کا زہر گھولنے لگتی ہیں۔"

ایک لڑکی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آپ سطحی باتیں کر رہی ہیں۔ یعنی آپ محض چائے کی مٹھاس کو دیکھ رہی ہیں۔ آپ کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ کبھی کبھی چائے سے منہ بھی جل جاتا ہے۔"

عزت نے جواب دیا۔ "یہ چائے پینے والی کی غلطی ہے۔ چائے پیش کرنے والے کی غلطی نہیں ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مٹھاس پیش کرتا ہے۔ اسے پھونک پھونک کر قبول نہ کرنے کا انجام جل جانا ہی ہے۔"

ناصرہ نے طنز کرنے والی کی جانب پیالی بڑھا کر کہا۔ "لیجیے۔ پھونک پھونک کر پیجیے...."

تمام لڑکیاں بے اختیار قہقہے لگانے لگیں۔

پھر اچھی خاصی گھریلو فضا قائم ہو گئی۔

اپنی اپنی باتیں منوانے کے لیے سب ایک دوسرے سے بحث کرنے لگیں۔ بحث کی نرمی و گرمی کے ساتھ ساتھ چائے کی پیالیاں کھنک رہی تھیں۔ چمچے بج رہے تھے۔ قہقہے ابل رہے تھے۔ تیور بدل رہے تھے۔ عورتیں جب باتیں کرنے بیٹھ جاتی ہیں تو انہیں آس پاس کی دنیا کا ہوش نہیں رہتا۔

وہ سب بھول گئی تھیں کہ وہ کہاں ہیں؟

کس مقصد کے لیے وہاں بیٹھی ہوئی ہیں؟

پورے ایک گھنٹہ کے بعد ملازم وہاں آ کر ٹرالی واپس لے گیا تو انہیں یک بیک احساس ہوا کہ بہت سارا وقت گزر گیا ہے اور وہ سب وہاں بحث کرنے کے لیے نہیں بلکہ ملازمت حاصل کرنے کے کے لیے آئی ہیں۔

نواز احمد درانی بہت دیر سے اوپری برآمدے میں کھڑے ہوئے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے زینے پر آ گئے۔

انہیں دیکھتے ہی تمام لڑکیاں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

کوئی اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔

کوئی اپنے ہونٹوں کی سرخی پر زبان پھیر کر چائے کی مٹھاس کو یاد کرتی ہوئی نواز صاحب کے چہرے کو تکنے لگی۔

ایک لڑکی اس طرح مسکرائی جیسے فوٹو کھنچوانے کی تیاری کر رہی ہو۔

دوسری لڑکی نے اس انداز سے وینٹی بیگ کو تھام لیا جیسے کسی دکان کی شو ونڈو میں آ کر کھڑی ہو گئی ہو۔

عزت کا بھی ایک انداز ہوتا' کوئی ایک ادا ہوتی۔ اچھی ہوتی یا بری ہوتی۔ عورت خاموشی سے کھڑی رہنے کے باوجود اداؤں سے خالی نہیں ہوتی لیکن عزت کو کچھ اور سوچنے اور سنبھلنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ نواز صاحب کی نظریں سیدھی اس پر پڑ رہی تھیں۔ ان نظروں میں کچھ ایسی انفرادیت تھی جو ذہن پر دستک دیتی ہیں۔

اس کی پلکیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

دوسرے ہی لمحہ احساس ہوا کہ وہ جھجک رہی ہے۔ بھلا اس میں جھجکنے کی کیا بات تھی؟

لیکن دوبارہ نظریں ملانا بھی کہاں کی شرافت تھی؟

ایسے وقت سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟ نظریں اٹھائی جائیں یا چرائی جائیں؟

کچھ میں نہیں آیا تو وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں الجھانے لگی۔

انگلیاں چٹخانے کا وہ کون سا وقت تھا؟ یہ تو کھلی گھبراہٹ کا اظہار تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔

لیکن وہ خالی ہاتھ کیسے رہ سکتی تھی؟ اندر سے ڈگمگانے والی بات ہو تو اوپر سے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس نے سہارے کے لیے دوپٹے کے آنچل کو تھام لیا۔

وہ کیسی کیسی بدحواسی کا مظاہرہ کر رہی تھی' وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں دی کیونکہ سب اپنے آپ میں کھوئی ہوئی تھیں۔ نواز صاحب نے بھی اسے ایک ہی بار دیکھا تھا۔

پھر وہ درمیانی زینے پر آ کر رکتے ہوئے بولے۔

"بیٹھ جائیے۔"

تمام لڑکیاں بیٹھ گئیں۔

لیکن عزت کھڑی رہی۔ نواز احمد درانی کا گھمبیر لہجہ ڈرائنگ روم میں دیر تک گونجتا رہا مگر اس کی سماعت تک نہ پہنچ سکا۔ سوچ کی بپھری ہوئی لہروں میں اتنا شور ہوتا ہے کہ دوسری کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

نواز صاحب نے پھر ایک بار اسے دیکھا۔ اس بار گہری نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"مس عزت آرا! کیا آپ جانا چاہتی ہیں؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

نواز صاحب نے دل ہی دل میں کہا۔ "عجیب لڑکی ہے۔ بیٹھنے کے لیے کہا تو کھڑی رہی۔ جانے کے لیے پوچھا تو بیٹھ گئی۔ یہ بہت زیادہ احمق ہے یا پھر بہت زیادہ چالاک ہے ایسے عجیب انداز کا مظاہرہ کرتی ہے کہ دیکھنے والے اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے متعلق یوں بھی اسکینڈل مشہور ہیں کہ یہ جہاں بھی کام کرتی ہے وہاں کسی نہ کسی کو دل لبھانے والے انداز سے اپنا اسیر بنا لیتی ہے۔

انہوں نے ہونٹوں کو بھینچ کر ناگواری کا اظہار کیا۔ انہیں اپنے رسالہ کے لیے خواتین کی ضرورت تھی۔ وہ عزت کو اس لئے برداشت کر رہے تھے کہ وہ باصلاحیت تھی' وہ اتنی معروف مصنفہ تھی کہ قارئین اس کا نام پڑھ کر رسائل اور ناول خریدا کرتے تھے۔

نواز صاحب نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا عزت آراء کے متعلق جو اسکینڈل ہیں' وہ درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ لہٰذا جب تک حقیقت سامنے نہیں آتی۔ اس وقت تک انہیں عزت کی صلاحیتوں سے کام لینا چاہیے۔ اگر کبھی وہ رسالے کے لیے بدنامی کا باعث بنے گی تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔

انہوں نے زینہ کی ریلنگ کو تھام کر کہا۔

"میں ماہنامہ "عزت" کے لیے تین قلمکار خواتین کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سب کا مشکور ہوں کہ آپ نے یہاں انٹرویو کے لیے آنے کی زحمت اٹھائی ہے۔ اب میں آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ انٹرویو ختم ہو چکا ہے اب آپ جا سکتی ہیں جن کا انتخاب ہو چکا ہے۔ ان کے ایڈریس پر اپوائنٹمنٹ لیٹرز بھیج دیئے جائیں گے۔"

تمام لڑکیاں حیرانی سے انہیں دیکھنے لگیں۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"انٹرویو ختم ہو چکا ہے؟ لیکن انٹرویو شروع کب ہوا تھا؟ آپ نے تو کوئی بات کی ہے اور نہ ہی کوئی سوال پوچھا ہے۔"

انہوں نے باری باری ہر لڑکی کی جانب دیکھا۔ سب ہی کی نظروں میں یہی سوال تھا کہ انٹرویو بغیر انتخاب کے کیسے ہو گیا؟ آخر میں انہوں نے عزت کی جانب دیکھا۔ اس کی نظروں میں بھی وہی سوال تھا لیکن آنکھ ملتے ہی وہ سوالیہ نظریں جھک گئیں۔

انہوں نے کہا۔ "میں بیمار نہیں ہوں۔ محض بیماری کا بہانہ کر کے آپ لوگوں کو اس کوٹھی میں بلایا ہے تاکہ آپ کو یہاں گھر کا سا ماحول ملے۔ جہاں چار عورتیں جمع ہو جاتی ہیں' جہاں ان کے درمیان چائے کی پیالیاں آ جاتی ہیں اور ایک گھریلو فضا قائم ہو جاتی ہے وہاں کسی انٹرویو کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ خود ہی بے تکان بولے چلی جاتی ہیں۔ انٹرویو کا کوئی سوال ان کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔ وہ باتوں کی روانی میں خود ہی اپنی ذہنیت' اپنی سوچ' اپنے نظریات اور اپنی ڈھکی چھپی عادتوں کو آئینہ کی طرح چمکا کر سامنے لے آتی ہیں۔

"میں نے اس آئینہ میں آپ لوگوں کا چہرہ دیکھا ہے اور انتخاب کیا ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ امیدوار خواتین کا انتخاب کرنے کے لیے اس سے اچھا اور کامیاب طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

عزت کی نظریں بے اختیار زینے کی جانب اٹھ گئیں۔ انہوں نے عورتوں کے متعلق کیسی ناقابل انکار حقیقت بیاں کی تھی۔ واقعی باتوں کے دوران اسے بھی یاد نہیں رہا کہ وہ کیا کچھ بول گئی ہے۔

اسے اب اس بات کی فکر نہیں تھی کہ وہ منتخب ہو گی یا نہیں؟ فکر تو اس کی بات کی ہو گئی کہ نہ جانے وہ اپنے متعلق کیا کہہ گئی ہے؟ لڑکیاں بہت سے نازک جذبوں کو اور

بہت سی کھٹی میٹھی عادتوں کو بڑے جتن سے چھپا کر رکھتی ہیں۔ توبہ ہے' یہ مرد بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اللہ قسم بڑے مکار ہوتے ہیں۔ کیسے کیسے حربوں سے کھنگال کر رکھ دیتے ہیں۔

اس نے شکایت آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔

وہ اُس کی سطح سے بہت اونچے نظر آئے۔ شاید اس لئے کہ زینے کی اونچائی پر کھڑے ہوئے تھے۔

وہ بڑی پروقار اور پکارتی ہوئی شخصیت کے مالک تھے۔

شاید وہ اس لئے ذہن پر چھا رہے تھے کہ انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں بھرپور تاثر چھوڑا تھا۔ بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ وہ سچی اور کھری بات کسی بھی عورت کو پتھر کی طرح لگتی مگر نہ جانے کیوں اسے پھول کی طرح لگی۔

نواز احمد درانی بڑی بے نیازی سے اوپری منزل کی جانب واپس جا رہے تھے۔

عزت بھی واپس جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

☆==============☆==============☆

عورت اسی کی تمنا کرتی ہے جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ شبنم کو بھی یہی محسوس ہوا کہ وہ اسے دیکھ سکتی ہے مگر چھو نہیں سکتی۔

اس کا نام کچھ اور تھا جب گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد بھی پیاس نہ بجھی تو اس نے اپنا نام شبنم رکھ لیا۔

شبنم کو ہر دل والا جانتا تھا اور اسے آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے ہوس کی نگاہوں سے سمجھنا چاہتا تھا۔ جو عورت شناس ہوتے ہیں وہ قصائیوں کی طرح سب سے پہلے عورت کے جسم کو اپنی نگاہوں سے ٹٹولتے ہیں اور جو زمانہ شناس ہوتے ہیں وہ عورت کے کردار اور اس کی شرم و حیا کو دیکھتے ہیں۔

شبنم کو شرم و حیا سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ عام طور پر ایسی عورت کو عورت نہیں کہا جاتا۔ وہ بازار میں بکنے والی جنس کہلاتی ہے لیکن شبنم بازار میں بیٹھنے والی عورت نہیں تھی۔ وہ شریفوں کے محلے میں رہتی تھی اور نہایت شریفانہ زندگی گزارتی تھی یعنی جس طرح شریف مرد کبھی غصہ میں آکر اپنی بیویوں کو مارتے پیٹتے ہیں اور انہیں گھر سے دھکے دے کر میکے جانے پر مجبور کر دیتے ہیں' اسی طرح شبنم بھی نہایت شرافت سے اپنے جس عاشق کو چاہتی' دھکے دے کر نکال دیا کرتی تھی۔

عورت کے ہاتھوں ذلت اٹھانے سے بہتر ہے آدمی مرجائے۔

مگر عاشق نہیں مرتے۔ ذلت کہیں سے ملے' وہ ذلت ہی ہوتی ہے خواہ مرد کے ہاتھوں سے عورت ذلیل ہو کر گھر سے نکلے یا مرد کسی عورت سے جھڑکیاں کھا کر ذلت اٹھاتا رہے۔ دونوں صورتوں میں انسانیت کی توہین لیکن اس محلے کے مرد ہمیشہ یکطرفہ فیصلہ کرتے تھے۔

ان کا فیصلہ تھا کہ عورت اگر اپنے خاوند کی جھڑکیاں سنتی ہے اور لات جوتے کھا کر گھر سے نکلتی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ عورت ایسی ہی

تقدیر لے کر دنیا میں آتی ہے۔

لیکن شبنم کا فیصلہ یہی تھا کہ عورت اپنی تقدیر آپ بنانا سیکھ لے تو مرد بڑی خوشی سے دھکے کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس نے کتنی محنت اور کتنی ہی ٹھوکریں کھانے کے بعد اپنی تقدیر بنائی تھی۔ دولت اور شہرت کبھی آسانی سے حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کے لیے بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ شبنم بھی اپنی زندگی کی انتہائی پستی سے آہستہ آہستہ ابھرتی ہوئی انتہائی بلندی تک آئی تھی۔

آج سے دس سال پہلے جب وہ تیرہ برس کی تھی تو اس کا نام شبراتن تھا۔ اس کے میلے اور پھٹے پرانے کپڑوں پر شبراتن جیسا پھٹا پرانا نام چھپا تھا۔ غریب لڑکیوں کے نام اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نام سن کر کسی گدگدی کا احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی تصور کی آنکھیں کسی نازک لڑکی کا سراپا بناتی ہیں۔

تیرہ برس تک اس پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔ محلے والے صرف اس کی ماں کی مظلومیت پر افسوس کرتے تھے کیونکہ اس کا باپ اکثر رات کو شراب پی کر آتا تھا اور اس کی ماں سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا کرتا تھا۔ وہ شبراتن کو لے کر محلے کے کسی گھر میں پناہ لیتی تھی۔ پھر دوسرے دن اپنے خاوند کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اور پاؤں پڑ کر اسے منا لیتی تھی۔

شبراتن نے بچپن ہی سے دیکھا تھا کہ عورت کتنی مجبور ہوتی ہے۔ خاوند کے سوا کوئی دوسرا سہارا نہیں ہوتا۔ اس لئے ہزار بار لات جوتے کھانے کے بعد بھی اس کے قدموں تلے رہنا پڑتا ہے لیکن خاوند کا ظلم اسی وقت تک برداشت ہوتا ہے جب تک کہ وہ ظالم ہونے کے باوجود اپنی بیوی اور بچوں کا ہو کر رہتا ہے۔

مگر ایک دن شبراتن کا باپ اس کی ماں کے لیے سوکن لے آیا۔ شبراتن کی ماں کو جب تک اس بات کا یقین تھا کہ اس کا خاوند صرف اس کا ہے اور کوئی دوسری عورت اس کے پیار اور مار کی حقدار نہیں ہو سکتی۔ اس وقت تک وہ اپنے خاوند کی ہر زیادتی برداشت کرتی رہی لیکن سوکن برداشت نہ ہوئی اور وہ بیٹی کو لے کر گھر سے نکل گئی۔

گھر سے نکلنے کے بعد وہ اکثر بابو لوہار کے ہاں پناہ لیتی تھی۔ بابو لوہار کی بھی ایک بیوی اور بیٹی تھی۔ بیٹی بیاہ کر سسرال چلی گئی تھی۔ صرف ایک بیوی تھی جو شبراتن کی ماں سے

بہن جیسی محبت کرتی تھی لیکن محبت جیسی بھی ہو، کسی پر بوجھ بن کر تین وقت کی روٹیاں کب تک کھائی جا سکتی ہیں۔ اس لئے وہ محلے کے گھروں میں کپڑے دھونے اور برتن مانجھنے کے کام میں لگ گئی۔

بابو لوہار نے شبراتن کو اپنے ساتھ کام میں لگا لیا۔ کام صرف اتنا تھا کہ آگ میں کوئلے ڈال کر دہکایا کرتی تھی اور بابو لوہار اس آگ میں لوہے کو تپا کر سرخ کر دیتا تھا۔ یہ کام گھر کے صحن میں ہوتا تھا۔ کبھی لوہے کی سلاخیں تپائی جاتی تھیں، کبھی پانی کی بالٹیوں یا ٹین کے سامان میں جوڑ لگائے جاتے تھے اور کبھی گھوڑوں کی نعلیں بنائی جاتی تھیں۔

پہلے دن وہ آگ دہکانے کے لیے بیٹھی تو بابو لوہار کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخی شبراتن کے چہرے کو لال گلنار بنا رہی تھی۔ وہ آگ میں پڑے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ اچانک بابو لوہار کے جی میں آیا کہ اسے بھی گرم لوہے کی طرح موڑ کر رکھ دے۔

مگر وہ لوہار تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ لوہے کو اپنی مرضی کے مطابق موڑنے سے پہلے اسے کس طرح آہستہ آہستہ گرم کیا جاتا ہے۔ شبراتن کی عمر ابھی کچی تھی۔ اس کے جسم میں انقلاب آ رہا تھا مگر وہ اس انقلاب کا مقصد نہیں سمجھتی تھی۔

بابو لوہار بڑی دل جمی سے اسے سمجھانے لگا۔ اس نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ بہت ہی دھیرے دھیرے بڑے اطمینان سے وہ اسے نظر بھر کے دیکھتا رہا۔ یعنی پہلے اسے نظروں کی آنچ سے گرماتا رہا۔ اس کی ماں اور اپنی بیوی کی نظریں بچا کر اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا۔

عورت فطرتاً شرمیلی ہوتی ہے۔ بابو لوہار کی بھوکی نظریں جب بھی اس کے کنوارے سینے پر پڑتیں، وہ شرما کر جلدی سے اپنا دوپٹہ درست کر لیتی تھی۔

نگاہوں کا یہ عمل کئی دنوں تک جاری رہا پھر وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کا دوپٹہ درست کرنے لگا اور رفتہ رفتہ اس پر ہاتھ پھیر کر اسے احساس دلانے لگا کہ وہ ایک جسم رکھتی ہے۔ ایک روز موقع پا کر اس نے اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

اس کی اس حرکت پر شبراتن رونے لگی۔ بابو لوہار گھبرا گیا کہ کہیں وہ اس کی بیوی سے شکایت نہ کر دے۔ اس نے جلدی سے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کے

ہاتھ پر رکھ دیا اور اس کی خوشامدیں کرنے لگا۔

وہ ذرا دیر رو کر چپ ہو گئی۔ وہ ایک روپیہ اس کی زندگی کی پہلی کمائی تھی۔ اسے اب تک یاد تھا کہ اس کا پہلا کنوارا بوسہ ایک روپے میں فروخت ہوا تھا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ اس میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ ایک پھول کی طرح کھلی جا رہی تھی۔ دبلے پتلے جسم میں گوشت بھرنے لگا۔ شانوں میں ایسی گولائی اور پھسلن آ گئی کہ دوپٹہ رہ رہ کر پھسل جاتا تھا۔ سینہ ایسا صحت مند تھا جیسے جوانی کے سارے خزانے اس نے وہیں سمیٹ کر رکھ لئے ہوں۔ جسم کے ایک ایک نشیب و فراز میں کتنی ہی قیامتیں چھپی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک ہی برس میں کئی برسوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔

اس کی ماں اور لوہار کی بیوی یہ انقلاب دیکھ دیکھ کر سہمی جا رہی تھیں۔ ایک رات انہوں نے شبراتن اور بابو لوہار کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ لوہار کی بیوی چھاتی پیٹ کر رونے لگی کہ جسے پناہ دی وہی سوکن بن گئی ہے۔ ماں نے بھی بیٹی کو خوب باتیں سنائیں۔ دو چار ہاتھ بھی جمائے مگر مارنے سے اسی کے ہاتھ جھنجھنا کر رہ گئے۔ شبراتن کا جسم بھٹی میں پکے ہوئے لوہے کی طرح سخت ہو گیا تھا۔ اس پر دو چار لات جوتے اثر نہیں کر سکتے تھے۔

آخر دونوں بوڑھی عورتوں نے یہی فیصلہ کیا کہ جلد از جلد اس کا بیاہ کر دیا جائے۔ جلدی میں کوئی اچھا لڑکا تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رشتے کے لیے ایک دولت مند بوڑھا مل گیا۔ شبراتن بابو لوہار کے عشق میں گرفتار تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ یہ شادی نہیں ہونے دے گا اور اسے ہمیشہ اپنی آغوش میں چھپا کر رکھے گا۔ مگر لوہار اپنی بیوی سے اور دنیا بھر کی بدنامیوں سے ڈرتا تھا۔ اس لئے وہ شبراتن کا ساتھ نہ دے سکا اور وہ زندگی میں پہلی بار جھوٹی محبت کا فریب کھا کر ایک بوڑھے خاوند کے گھر چلی آئی۔

بوڑھا آخر بوڑھا ہی تھا۔ شبراتن کی جوانی کے ساتھ نہیں دوڑ سکتا تھا۔ اس لئے اسے دولت کی چمک دمک سے بہلاتا تھا۔ چھ ماہ کے عرصہ میں اس نے شبراتن کے لیے بیس ہزار کے زیورات بنوا دیئے۔ اس کی سوکن دیکھ دیکھ کر جلتی کڑھتی رہتی تھی۔ سوکن کا ایک جوان بیٹا تھا جو اپنے باپ کے حکم سے شبراتن کو پڑھایا لکھایا کرتا تھا۔ وہ اردو کی سات جماعتیں پڑھی ہوئی تھی۔ جوان بیٹا برکت علی اسے انگریزی پڑھایا کرتا تھا۔

انگریزی کی پہلی کتاب ختم ہو گئی۔ دوسری کتاب بھی ختم ہو گئی۔ تیسری کتاب شروع

کرنے سے پہلے ہی وہ بیس ہزار کے زیورات اور دو ہزار روپے نقد لے کر برکت علی کے ساتھ فرار ہو گئی۔

برکت علی نے قسمیں کھا کر اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس سے سچی محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ شبراتن بھی عورت تھی۔ وہ اپنی جوانی کو بوڑھے کی دولت سے نہیں بہلا سکتی تھی۔ اس لئے اس کے ساتھ بھاگ کر دوسرے شہر آ گئی۔

پہلی بار وہ بابو لوہار سے محبت کا فریب کھا چکی تھی۔ لہٰذا اب ذرا محتاط تھی۔ اس نے زیورات اور نقد روپے اپنے پاس رکھے تھے اور اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے پاس سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرے گی۔

برکت بھی اپنے ساتھ تین ہزار روپے اور اپنی ماں کے زیورات چرا کر لایا تھا۔ تین ماہ تک وہ تین ہزار روپے بڑی فراخدلی سے خرچ ہوتے رہے پھر ماں کے زیورات بیچنے کا وقت آ گیا۔ تمام زیورات تقریباً دس ہزار روپے کے تھے۔ شبراتن نے اسے دو ہزار نقد دے کر تمام زیورات کو اپنی تحویل میں لے لیا اور انہیں ایک بینک کے لاکر میں لے جا کر محفوظ کر دیا۔ برکت اس کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ شبراتن نے بھی اس عرصہ میں نچانے کا فن سیکھ لیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا تیسرا مرد تھا۔ تین مردوں نے اسے تین صدیوں کا تجربہ سکھا دیا تھا۔ اب وہ پرانی شبراتن نہیں تھی۔ برکت اسے بڑے پیار سے شبو کہا کرتا تھا۔

پانچ ماہ کے بعد تمام نقد روپے ختم ہو گئے تو شبو نے اسے محنت مزدوری کرنے کے لیے کہا۔ برکت نے ہمیشہ عیش و آرام سے زندگی گزاری تھی۔ مزدوری اس کے بس کا روگ نہیں تھی۔ وہ شبو کو ناراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے مزدوری کے بہانے شبو کے گھر سے نکلا اور واپس اپنے شہر آ گیا۔

وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ بوڑھے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی ماں اسے تلاش کرنے کے لیے اخباروں میں خبریں چھپوا رہی تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر ماں نے اسے کلیجہ سے لگا لیا اور اس کی پچھلی غلطیاں اس لئے معاف کر دیں کہ اس کی نظروں میں بیٹا نادان تھا۔ ایسی غلطیوں کے موقع پر عورت مکار اور مرد معصوم سمجھا جاتا ہے۔

برکت نے اپنے مرحوم باپ کا کاروبار اور جائیداد سنبھال لی۔ اس نے ماں سے یہ نہیں بتایا کہ وہ شبو کو کہاں چھوڑ آیا ہے۔ وہ کاروبار کے بہانے ایک روز شبو کے پاس آیا

اور اپنی مجبوریاں ظاہر کرنے لگا۔

"میں مجبور ہوں شبو! نہ لاکھوں روپے کی جائیداد چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ہی تمہارا خیال دل سے نکال سکتا ہوں۔ لہٰذا میں تم سے چوری چھپے ملا کروں گا اور تمہارے تمام اخراجات پورے کروں گا۔"

شبو نے کہا۔ "تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور گناہگاروں کی طرح چھپ کر ملنا چاہتے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ داشتہ بنا کر رکھنا چاہتے ہو؟"

برکت نے تسلیم کر لیا کہ وہ داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ شبو نے بھی انکار نہیں کیا۔ اس نے اپنے مستقبل کی ضمانت کے لیے چند شرائط پیش کر دیں۔ ایک کوٹھی' ایک کار کے علاوہ ماہانہ پانچ ہزار روپے کا مطالبہ کیا۔ ایک ساتھ تمام شرائط کو پورا کرنا ممکن نہیں تھا۔ برکت آہستہ آہستہ اس کے مطالبات پورے کرنے لگا۔

ایک سال کے عرصہ میں شبو نے بہت کچھ حاصل کر لیا۔ سوسائٹی کے علاقہ میں ایک کوٹھی اس کے نام ہو گئی۔ گھومنے کے لیے ایک مرسڈیز کار مل گئی۔ تیس ہزار کے زیورات پہلے ہی لاکر میں پڑے ہوئے تھے۔ اب پچاس ہزار کے زیورات ہو گئے۔ ہر ماہ جو پانچ ہزار روپے ملا کرتے تھے' ان میں سے اس نے پچاس ہزار کی بچت کی تھی۔ اب اس کے ہاں ایک گورنس آیا کرتی تھی جو اسے انگریزی سکھانے کے علاوہ اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھایا کرتی تھی۔

ایک سال کے بعد برکت کی شادی کسی رئیس خاندان کی لڑکی سے ہو گئی اور وہ شبو کی کوٹھی کا راستہ بھولنے لگا۔ یہ فریب کھانے کے لیے وہ پہلے سے تیار تھی۔ اس لئے اس نے برکت کو دل و جان کا مالک نہیں بنایا تھا۔ اس دوران اس کے بھی چاہنے والے اتنے پیدا ہو گئے تھے کہ اسے برکت کے لیے آنسو بہانے کی فرصت نہیں ملی۔

اس نے سوسائٹی کی کوٹھی کو کرائے پر اٹھا دیا۔ ہر ماہ اس کوٹھی سے دو ہزار روپے کی آمدنی ہونے لگی۔ اسے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اس دنیا میں نہ مرد زور آور ہوتا ہے اور نہ ہی عورت طاقتور ہوتی ہے۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے اسی کا سکہ چلتا ہے۔ سب اس کے پیچھے دیوانے ہو جاتے ہیں۔

وہ ڈرگ کالونی میں ایک کرائے کا مکان لے کر رہنے لگی۔ شروع شروع میں وہاں

کے لوگ اس کی آمد پر دبی زبان سے اعتراض کرنے لگے کیونکہ اس کے مکان پر ہر رات ایک نہ ایک کار والا آتا تھا۔ وہ کار میں بیٹھ کر جاتی تھی اور صبح واپس آجاتی تھی۔ یہ بات واقعی قابل اعتراض تھی مگر لوگ زیادہ عرصہ تک اعتراض نہ کر سکے کیونکہ شبو جو اب اونچی سوسائٹی میں جا کر شبنم بن گئی تھی اس کے طفیل سے محلے میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی جا رہی تھیں۔

سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ میونسپلٹی کے مہتر روزانہ محلے کی گندی گلیوں کو بلاناغہ صاف کرنے لگے۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ شبنم کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ اوپر سے احکامات آئے ہیں کہ محلے میں کہیں گندگی نظر نہ آئے۔ بجلی کے کھمبوں میں جہاں جہاں بلب فیوز ہو گئے تھے‘ اب وہاں نئے بلب روشن ہو گئے تھے۔ محلے کے سامنے اوباش قسم کے نوجوان بیٹھ کر تاش کھیلتے اور ننگی گالیاں بکتے رہتے تھے۔ ایک روز شبنم وہاں سے گزری تو وہ اس پر بھی آوازیں کسنے لگے اس کے آدھے گھنٹے بعد اچانک پولیس کی ایک جماعت نے چھاپہ مارا اور انہیں جوا کھیلنے کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئے۔

گرفتار ہونے والوں کے والدین اور سرپرست انہیں ضمانت پر رہا کرانے کے لیے دوڑ دھوپ میں لگے رہے مگر کسی کی ضمانت منظور نہیں کی گئی۔ دو گھنٹے بعد شبنم تھانے میں آئی۔ اس نے فون اٹھا کر کسی افسر سے رابطہ قائم کیا۔ تھوڑی دیر تک اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی‘ باتوں کے دوران گرفتار ہونے والوں کا بھی تذکرہ کیا اور انہیں چھوڑ دینے کی درخواست کی۔ اس فون کے جواب میں تھانیدار کو ایک فون موصول ہوا جس کے بعد وہ گرفتار ہونے والے رہا کر دیئے گئے۔

یہ ایسا واقعہ تھا کہ تمام محلے والوں پر شبنم کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس کے متعلق لوگوں کے خیالات بدل گئے۔ اب وہ کوئی گنہگار عورت نہیں تھی بلکہ نہایت ہی شریف عورت تھی اور کاروں میں بیٹھ کر جو لوگ اس سے ملنے آتے وہ بھی شریف لوگ تھے۔

اس کے متعلق لوگوں کے خیالات اس لئے بدل گئے تھے کہ انہوں نے اس کے اثر و رسوخ کا اندازہ کر لیا تھا اور اب وہ اسے بدکار عورت کہہ کر اور اس کی برائیاں کر کے اس سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ جب کسی کی طاقت کے آگے بس نہیں چلتا ہے تو اس سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

وہ کتنی ہی محنت سے اور کتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد اس قابل ہوئی تھی کہ لوگ اس کے عیبوں کو جاننے کے باوجود اس کی طرف انگلی اٹھانے کی جرات نہیں کرتے تھے۔

سب ہی اس سے مسکرا کر ملتے تھے اور بڑے ہی مہذب انداز میں گفتگو کرتے تھے۔

البتہ ایک نوجوان تھا جو اس کے قریب بھی نہیں آتا تھا۔ دور ہی دور سے کترا کر نکل جاتا تھا۔ اور بھی لوگ ہوں گے جو اس سے کتراتے ہوں گے لیکن شبنم کی نظریں خاص طور پر اس نوجوان کو ڈھونڈتی تھیں۔ آج تک اس نے کسی کو پسند نہیں کیا تھا۔ سب اسے پسند کرتے تھے اور اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ عورت اس کی تمنا کرتی ہے جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ شبنم کو بھی یہی محسوس ہوا کہ وہ اسے دیکھ سکتی ہے مگر چھو نہیں سکتی۔

اس نے پہلے دولت کی ہوس کی۔ اسے دولت مل گئی‘ کوٹھی مل گئی‘ کار مل گئی۔ اس نے اپنی کوششوں سے بہت دور دور تک اثر و رسوخ بھی پیدا کر لیا‘ اب اس کی دلی تمنا تھی کہ وہ نوجوان حاصل ہو جائے۔

وہ بہت تھک گئی تھی۔ اب اسے چاہنے والوں کی تمنا نہیں تھی۔ وہ ایسے ساتھی کی تلاش میں تھی جو اسے چاہے یا نہ چاہے لیکن وہ اسے چاہتی رہے اور اس پر ہزار جان سے قربان ہوتی رہے۔

عورت خواہ کتنی ہی بدکار ہو۔ عاشقوں کے ہجوم میں کسی ایک مرد کو اتنی شدت سے اور اتنی نیک نیتی سے چاہتی ہے کہ تمام عمر اس کی عبادت کرتی رہ جاتی ہے۔

وہ نوجوان اس کی عبادت بن گیا تھا۔

اس نوجوان کا نام فرہاد انور تھا۔

☆===========☆===========☆

عجیب ہے یہ دنیا دوسروں کے غم میں شریک نہیں ہوتی
مگر دوسروں کی خوشی سے جلتی ہے۔ بھائی بے روزگار ہو تو
کوئی نہیں پوچھتا۔ بہن ملازمت کرے تو سب بدنام کرنے
کے لیے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

کچھ لوگوں کے نام ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تقدیر بھی اس نام کے مطابق عمل کرنے لگتی ہے۔ فقیر محمد جیسا نام رکھنے والے ہمیشہ فقیری حالت میں زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔ جن کا نام رئیس احمد ہوتا ہے' وہ اکثر کاروں اور کوٹھیوں میں نظر آتے ہیں۔

فرہاد انور کی تقدیر میں بھی عمل کا تیشہ اور زندگی کے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی ضروری ہے کہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر بہانے سے پہلے کسی شیریں سے محبت کی جائے۔ بھوک' بے روزگاری اور محتاجی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو اس وقت عشق نہیں بھائی دیتا۔ ایسے وقت عمل اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

فرہاد انور برسوں سے جدوجہد کر رہا تھا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد کتنے ہی دفتروں' کارخانوں اور ملوں میں اس نے ملازمت کی کوششیں کیں۔ کہیں دو چار مہینے کی عارضی ملازمت ملی اور ختم ہو گئی۔ کہیں مستقل ملازمت ملی تو مل ایریا گھر سے پچیس تیس میل کی دوری پر تھا۔ آنے جانے اور دوپہر کے کھانے کے اخراجات کا حساب کیا تو آدھی سے زیادہ تنخواہ اس کی ذات پر صرف ہو جاتی تھی۔

پھر ایسی بھی ملازمت ملی جہاں مڈل پاس لوگ آفیسر تھے اور وہ گریجویٹ ہو کر ان کا ماتحت تھا۔ وہ ایسی توہین برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بی اے کی سند کو صندوق کی تہہ میں چھپا کر رکھ دیا اور آوارہ گردی کرنے لگا۔

اس نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اب بی اے کی سند سے نہیں صرف تقدیر سے ہی ملازمت مل سکتی ہے۔ فضول دوڑ دھوپ کرنے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ جب تقدیر مہربان ہو گی تو ملازمت مل جائے گی۔

وہ حسب معمول تمام دن مارا مارا پھرتا رہا۔ شام کو گھر آیا تو اس کی والدہ رات کا کھانا تیار کر رہی تھیں اور اس کی بہن عزت آرا لکھنے کی میز پر جھکی ہوئی کسی گہری سوچ میں گم

تھی۔

وہ دروازے پر رک کر عزت کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ بھائی کمرے میں آگیا ہے۔ وہ کہیں دور کھوئی ہوئی تھی اور خیال ہی خیال میں مسکرا رہی تھی۔

فرہاد خاموشی سے پلٹ کر اپنی والدہ کے پاس کچن میں آگیا اور ان کے قریب بیٹھ کر بولا۔

"یہ کہانیاں لکھنے والی لڑکیاں پاگل ہوتی ہیں۔ ہر وقت کہانیوں کے متعلق سوچتی ہیں۔ کہانی کا کوئی کردار مسکراتا ہے تو وہ بھی بے اختیار مسکرانے لگتی ہیں اور اگر کوئی کردار روتا ہے تو وہ بھی رونے والی صورت بنالیتی ہیں۔"

اس کی والدہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر عزت کے کمرے کی جانب دیکھا پھر سر جھکا کر بولی۔ "میں پہلے یہی سمجھتی تھی کہ وہ اپنی کہانی میں ڈوب کر مسکراتی ہے اور کبھی اداس ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک رات میں نے نیند کی حالت میں اسے روتے دیکھا ہے۔ تم ہی بتاؤ بیٹے! کیا نیند میں بھی وہ کوئی دردناک کہانی سوچ رہی تھی؟ نہیں' میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ اس عمر میں لڑکیاں خود ایک کہانی بن جاتی ہیں۔

"اب وہ ستائیس برس کی ہو گئی ہے۔ اگر اس کی شادی ہو جاتی تو اب تک دو چار بچوں کی ماں بنی ہوتی لیکن شادی کیسے ہوگی۔ جب سے ملازمت کے لیے نکلی ہے تب ہی سے بدنامی پیچھا کر رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو بدنام کرنے والوں کی زبان پر چھالے پڑیں گے۔ میری نیک سیرت بچی پر تہمتیں لگاتے ہیں۔"

فرہاد نے کہا۔ "امی! میری بہن اتنی اچھی ہے کہ میں اس کے آنچل پر نماز پڑھ سکتا ہوں لیکن دنیا والے ظاہری ثبوت دیکھ کر بدنام کرتے ہیں۔ میں نے عزت کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ جس ادارے میں کام کرتی ہے اس ادارے کے مالکوں کی کاروں میں بیٹھ کر گھر نہ آیا کرے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔"

اس کی ماں نے ناراضگی سے کہا۔ "وہ کیا اپنی مرضی سے بیٹھ کر آتی ہے؟ ایک جگہ کام کرنے سے آپس میں خلوص اور اعتماد کا رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اعتماد اور ہمدردی سے اپنی کار میں یہاں تک لانا چاہے تو کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟"

"میں مانتا ہوں کہ اخلاقاً انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ہم محلے والوں کی زبانیں کس طرح بند کریں؟ آج چھ ماہ سے اس محلے میں وہ شبنم نام کی عورت آئی ہے۔ اسے بھی بڑی بڑی کار والے اس محلے کے دروازے پر چھوڑنے آتے ہیں جو شرمناک باتیں اس کے متعلق کہی جاتی ہیں' وہی باتیں عزت کے متعلق بھی دہرائی جاتی ہیں۔ کوئی میرے سامنے ایسی باتیں نہیں کہتا ورنہ میں اس کا خون پی جاتا...."

"تم مارنے والے کا ہاتھ پکڑ سکتے ہو مگر کہنے والوں کی زبان نہیں پکڑ سکتے۔ لوگوں کی زبانیں بند کرنے کا یہی ایک راستہ ہے کہ عزت اب کہیں ملازمت نہ کرے۔ تمہیں تو اب ملازمت ملنے سے رہی۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہو۔ میں حیران ہوں کہ عزت کو ہر جگہ ملازمت مل جاتی ہے مگر تمہیں نہیں ملتی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ عزت نے بھی بی اے کیا ہے اور تم بھی بی اے پاس ہو....؟"

"امی! ہم دونوں میں یہ فرق ہے کہ عزت کے پاس تعلیم اور لکھنے کا فن ہے۔ وہ سترہ سال کی عمر سے لکھ رہی ہے۔ دس برس کے عرصہ میں اس نے اتنا نام پیدا کیا ہے کہ جہاں وہ جاتی ہے' وہاں اسے ملازمت مل جاتی ہے۔ میرے پاس صرف تعلیم ہے' اس دور میں جس کے پاس ہنر یا فن نہیں ہوتا' اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ کئی بار عزت سے کہا کہ وہ ملازمت نہ کرے' خواہ مخواہ کی بدنامی اٹھانے سے بہتر ہے کہ ہم بھوکوں مر جائیں۔ مگر وہ نہیں مانتی۔ کسی کی نہیں سنتی۔ اپنی ہی من مانی کرتی ہے۔"

اس کی والدہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ "ہاں' وہ ضدی ہے کسی کی نہیں سنتی۔ ساری زندگی ملازمت کرتی رہے گی۔ ہمارا پیٹ بھرتی رہے گی مگر سہاگن نہیں بن سکے گی۔ شادی کی بات کرو تو ایسے ٹال دیتی ہے جیسے دل کی تمام آرزوئیں مر چکی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ اندر سے مردہ نہیں ہے۔ میں اس کے دل کا درد سمجھتی ہوں کیونکہ میں نے اسے نیند کی حالت میں روتے دیکھا ہے...."

یہ کہتے ہوئے ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میری بچی کتنی بدنصیب ہے۔ ہمارے لئے جی رہی ہے اور اپنے لیے مرتی جا رہی ہے۔ جب وہ بچپن میں گڑیا کا بیاہ رچاتی تو میں اسے چھیڑنے کے لیے کہتی کہ ایک دن

تیری بھی شادی کروں گی۔ جب تو بڑی ہو جائے گی تو ایک بہت بڑے ملک کا بہت ہی خوبصورت شہزادہ تجھے بیاہ کر لے جائے گا۔ تو ایک بہت بڑے محل میں جائے گی اور دولت کے انبار میں بیٹھ کر حکومت کرے گی۔

"کیا بچپن کی باتیں اسے یاد نہیں آتی ہوں گی؟

"کیا وہ ایک اونچے گھرانے میں دلہن بن کر جانے کے خواب نہیں دیکھتی ہوگی؟

"ضرور دیکھتی ہوگی۔ خواب دیکھتی ہے اسی لئے تو چھپ چھپ کر روتی ہے۔ آہ! میں اس کی ماں ہوں، مگر ماں کا آنچل بھی اس کے آنسو نہیں پونچھ سکتا....."

فرہاد کا دل کٹنے لگا۔

اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔

وہ جوان بھائی تھا۔ مگر اس دنیا کے بازار سے اپنی چھوٹی بہن کے لیے خوشیاں نہیں خرید سکتا تھا۔

"میں کیا کروں؟

وہ جھنجلا کر سوچنے لگا۔

"کس کے دروازے پر جاؤں؟ کس کے قدموں پر اپنی سند اور اپنا سر رکھ کر کہوں کہ مجھے ملازمت دو۔

"چاہو تو ملازمت کے نام پر میرا خون نچوڑ لو مگر اتنے پیسے دو کہ میری بہن کی آنکھوں سے آنسو خشک ہو جائیں۔ لیکن کوئی کسی کی غربت اور عزت کا احساس نہیں کرتا۔ اس دنیا کا ہر شخص اپنے آپ میں مست رہتا ہے۔ دوسروں کے دکھ درد سمجھنے کا دستور ختم ہو چکا ہے۔

"عجیب ہے یہ دنیا۔ دوسروں کے غم میں شریک نہیں ہوتی مگر دوسروں کی خوشی سے جلتی ہے۔ بھائی بے روزگار ہو تو کوئی نہیں پوچھتا۔ بہن ملازمت کرے تو سب کے سب بدنام کرنے کے لیے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

"دراصل آوارہ اور بدچلن عورتوں نے باہر نکلنے والی شریف عورتوں کو بدنام کر دیا ہے۔ وہ شبنم جب سے یہاں آئی ہے، لوگوں کی نگاہیں پھر عزت کی جانب اٹھنے لگی ہیں۔ کھوٹے اور کھرے کی کوئی تمیز ہی نہیں کرتا۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"امی! وہ شبنم نہایت ہی ذلیل اور آوارہ قسم کی عورت ہے۔ اس کی وجہ سے....."

اس کی والدہ نے بات کاٹ دی۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ تمہیں شرم نہیں آتی کسی عورت پر الزام لگاتے ہوئے.....؟"

"لیکن امی! یہ جھوٹا الزام نہیں ہے۔ سب ہی اس کے متعلق یہی کہتے ہیں۔"

"عزت کے متعلق بھی سب یہی کہتے ہیں۔ کسی کے کہنے سے کوئی اچھا یا برا نہیں ہو جاتا۔ انسان کی اچھائی یا برائی اس کے ساتھ جاتی ہے۔ تم کون ہوتے ہو اس عورت کو بدنام کرنے والے؟ کیا اپنی بہن کی جھوٹی بدنامی سے تم سبق حاصل نہیں کر سکتے؟"

فرہاد کا سر جھک گیا۔

جب اپنے پر بات آتی ہے تو دوسروں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس کی والدہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ کون سی عورت اپنے کن حالات سے گزرتی ہے، یہ سب نہیں جانتے۔ اور اس کے متعلق کچھ نہ جان کر اپنی طرف سے غلط رائے قائم کرنا دانشمندی نہیں ہے۔

شبنم اچھی ہو تو اپنے لئے، بری ہو تو اپنے لئے۔ اس سے غرض ہی کیا؟ فرہاد نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

اسی وقت عزت نے اپنے کمرے سے آواز دی۔ "امی! یہاں آیئے۔ آمنہ بوا آپ سے ملنے آئی ہیں۔"

اس کی والدہ بیٹی کی ایک آواز پر کچن سے نکل کر اس کے کمرے میں آگئیں۔ فرہاد بھی عزت سے باتیں کرنے کے لیے چلا آیا۔

آمنہ بوا ایک بوڑھی عورت تھی اور محلے کے گھروں میں اوپری کام کر کے اپنا پیٹ پالتی تھی۔ عزت کی والدہ نے پوچھا۔

"کیسی ہو آمنہ؟ آج کل دکھائی نہیں دیتیں۔ کہاں رہتی ہو؟"

"اسی محلے میں ہوں۔ شبنم بی بی کے ہاں کام کر رہی ہوں۔"

شبنم کا نام سن کر فرہاد بے اختیار آمنہ کو دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "کیا بتاؤں بہن! وہ مالکن لاکھوں میں ایک ہے۔ اتنی رحمدل ہے کہ کسی کو پریشان حال نہیں دیکھ سکتی۔ آج باتوں ہی باتوں میں فرہاد کا ذکر نکل آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ فرہاد میرے ہی بیٹوں جیسا ہے۔ بے چارہ ملازمت کی تلاش کرتا ہے مگر کہیں نوکری نہیں ملتی۔ شبنم بی بی نے جھٹ

سے کہا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ کل ہی ملازمت مل سکتی ہے۔"

"اچھا!" عزت کی والدہ نے خوش ہو کر کہا۔ "اللہ اسے نیکی دے' میں پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ اچھی عورت ہے۔"

فرہاد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مگر امی! میں ملازمت کی خاطر اس عورت کے سامنے نہیں جانا چاہتا...."

عزت نے حیرانی سے پوچھا۔

"بھائی جان! یہ کیا بات ہوئی؟ آپ شبنم کے سامنے کیوں نہیں جانا چاہتے؟"

آمنہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اے بٹی! فرہاد سے کیا پوچھتی ہو' مجھ سے پوچھو۔ شبنم بی بی بہت سمجھدار ہے۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا کہ میں بدنام عورت ہوں' شریف لوگ مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ میں پتہ لکھ کر دیتی ہوں اس پتہ پر فرہاد کو بھیج دینا۔ ملازمت ضرور ملے گی۔ یہ دیکھو اس نے پتہ لکھ کر دیا ہے۔"

آمنہ نے اپنے آنچل کی گرہ کھول کر ایک کاغذ کا پرزہ نکالا اور عزت کو دیتے ہوئے کہا۔ "شبنم بی بی نے کہا ہے کہ کل شام کو سات بجے اس کوٹھی میں چلے جائیں۔ وہ آفیسر کو فون پر کہہ دیں گی۔"

اس کی والدہ نے کہا۔ "واقعی بہت اثر و رسوخ والی ہے۔ آخر یہ ہے کون' کہاں سے آئی ہے؟"

آمنہ نے جواب دیا۔ "بے چاری بیوہ ہے۔ ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اس کے خاوند نے اپنے پیچھے اچھی خاصی دولت اور جائیداد چھوڑی ہے۔ اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے۔"

عزت اور اس کی والدہ افسوس ظاہر کرنے لگیں۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ شبنم سے میل ملاپ رکھنے اور اس کے کسی کام آنے کی کوشش کرتیں۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ شبنم نے فرہاد کی بے روزگاری بہت پرانا مسئلہ حل کیا تھا۔ اب ان کا بھی فرض تھا کہ وہ اس سے ہمدردی کرتیں اور اس کی بیوگی اور تنہائی کے احساس کو مٹانے کی کوشش کرتیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ بھی بدنام تھی یہ بھی بدنام تھے۔

یہ اگر اس سے میل ملاپ بڑھاتے تو محلے والے یہی کہتے کہ جیسے لوگ تھے ویسی ہی صحبت اختیار کی ہے۔

ان کے دل میں شبنم کے لیے خلوص پیدا ہو گیا تھا۔ مگر وہ دنیا والوں کے ڈر سے خلوص و ہمدردی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

"لیجئے بھائی جان! ہمیں شبنم کے اس جذبہ کی قدر کرنی چاہیئے۔ آپ کل شام کو ضرور اس پتہ پر جایئے۔ اگر کوئی ایسا موقعہ آیا تو ہم بھی اس کے کام آئیں گے۔ آمنہ بوا تم ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دینا اور اپنی بی بی جی سے کہنا کہ ہمارے اور اس کے درمیان کوئی نفرت نہیں ہے۔ صرف دنیا والوں کا خوف ہے...."

فرہاد گہری سنجیدگی سے اپنی بہن کو دیکھنے لگا۔

عزت اس سے نفرت کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ شبنم کی ہمدردی سے متاثر ہو گئی تھی لیکن فرہاد کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ عورت قابل نفرت ہے یا نہیں؟

محلے والے اس کے متعلق بڑی شرمناک باتیں کرتے تھے جنہیں سن کر نفرت ہو جاتی تھی۔ لیکن آمنہ بوا نے بتایا تھا کہ وہ ایک رحم دل بیوہ ہے۔ اس لحاظ سے اس سے ہمدردی ہو جاتی تھی۔ رہ گئی یہ بات کہ اس کے ہاں بڑے بڑے لوگوں کی کاریں کیوں آتی ہیں۔ تو اس کی بھی کوئی معقول وجہ ہوگی۔ عزت بھی کئی بار کاروں میں آ چکی ہے۔ لوگ اس کی پاکیزگی پر بھی کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ سب نادانستگی میں شبنم کو بھی بدنام کر رہے ہوں۔

بہرحال حقیقت ہمیشہ چھپی نہیں رہتی۔ فرہاد نے سوچا۔ اگر وہ سچ مچ گناہگار ثابت ہوئی تو میں اس کا احسان اٹھانے سے انکار کر دوں گا۔

وہ سر جھکا کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اس وقت اس کی سوچ میں شبنم ہی شبنم تھی۔ اس عورت سے کترانے کے باوجود وہ بے خیالی میں اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔

بہت سی عورتوں کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ جب چاہتی ہیں۔ دوسروں کو اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

فرہاد کی مٹھی میں کاغذ کا پرزہ تھا۔
نہیں' کاغذ کا پرزہ نہیں تھا۔ اس کی ملازمت کا یقین اور شاندار مستقبل کا ضمانت نامہ تھا۔

یہ بھی نہیں۔ وہ کاغذ کا پرزہ ایک بجلی کا سوئچ تھا۔ یہ سوئچ اس کی مٹھی میں آتے ہی سوچ کے اندھیرے میں شبنم کا سراپا روشن ہوتا چلا گیا تھا۔

O☆O

ایک پھول کا نام بھی نرگس ہوتا ہے اور ایک لڑکی کا نام بھی نرگس ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نرگسی پھول کھلنے کا ذکر ہو تو ذہن میں آپ ہی آپ کسی اور نرگس کا چہرہ کھل جاتا ہے۔

عزت آراء ماہنامہ عزت کی مدیرہ کی حیثیت سے منتخب ہو گئی۔

ناصرہ پروین اور فرزانہ فہیم کا بھی انتخاب ہو گیا تھا۔ اپوائنٹمنٹ ہوتے ہی تینوں نے مل بانٹ کر پرچہ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ معلوماتی مضامین' دلچسپ افسانے' سچی کہانیاں' معروف خواتین کے انٹرویو' خطوط کے جوابات' کچن کے لذیذ پکوان اور حسن و صحت برقرار رکھنے کے نسخے۔ زندگی کے کتنے ہی رنگ تھے جنہیں "عزت" کے ایک آنچل میں باندھنا تھا۔

وہ تینوں تندہی سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

جن مضامین اور افسانوں کو وہ اشاعت کے لیے منتخب کرتی تھیں۔ نواز صاحب ان پر تنقیدی نظر ضرور ڈالتے تھے۔ اگر کسی پر اعتراض ہوتا تو اس کے لیے بحث شروع کر دیتے تھے کہ ایسا کیوں ہے؟ ویسا کیوں نہیں ہو سکتا؟

یہ مرد کیا جانیں کہ خواتین کے رسالے میں ایسا کیوں ہوتا ہے اور ویسا کیوں نہیں ہو سکتا؟

نواز صاحب نے ایک کہانی پر اعتراض کرتے ہوئے بحث کی۔ "اس کہانی میں ایک جوان لڑکی ماجدہ ہے' جو جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی عادی ہے۔ ایک جوان اور دولت مند لڑکا سراج اس کا آئیڈیل ہے۔ وہ خیال ہی خیال میں اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کے ساتھ کاروں میں گھومتی ہے۔ تفریح گاہوں میں جاتی ہے اور اس کی شاندار کوٹھی میں پیار و محبت کے حسین لمحات گزارتی ہے۔

"لیکن جب سراج کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لیتا ہے تو ماجدہ کی آنکھوں سے خواب چھن جاتے ہیں اور صرف آنسو رہ جاتے ہیں۔

"مصنفہ نے ماجدہ کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے اپنے قلم کا سارا زور صرف کر دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ماجدہ سے ہمدردی نہیں ہوتی کیونکہ وہ خود غرض تھی۔ دیکھا جائے تو اسے سراج سے محبت نہیں تھی' اس کی دولت سے محبت تھی۔ اس کی کار اور کوٹھی سے محبت تھی۔ عورت محبت کی بازی ہار جائے تو اس سے ہمدردی ہوتی ہے۔ وہ دولت کی بازی ہار جائے تو وہ محض کاروباری نقصان ہوتا ہے۔ بھئی مجھے تو ماجدہ کے آنسوؤں نے متاثر نہیں کیا...."

عزت یونہی نواز صاحب کو دیکھتی رہ گئی۔ دولت مند نوجوان' کار' کوٹھی' آرام و آسائش کی زندگی' ایک دلچسپ خواب مگر بہت پرانا خواب جو ہمیشہ سے عورت کی آنکھوں میں جلتا رہا ہے۔ ویسے کہانی کا سنٹرل آئیڈیا کچھ اور تھا لیکن نواز صاحب کے نقطہ نظر سے کچھ اور بن گیا تھا۔

ناصرہ پروین نے کہانی کی ماجدہ سے ہمدردی کی۔

"نواز صاحب میں آپ کے خیال سے متفق نہیں ہوں۔ مجھے تو ماجدہ نے متاثر کیا ہے۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "یہ عورتوں کی کمزوری ہے کہ وہ آنسو دیکھ کر متاثر ہو جاتی ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کتنے خود غرض اور لالچی جذبے انہیں رلاتے ہیں۔"

عزت نے شکایت آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔

وہ عورتوں کے متعلق کتنی غلط رائے قائم کر رہے تھے۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہا۔ "لالچ اور ایک اچھے مستقبل کی تعمیر کی آرزو کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے ایک اچھی' ٹھنڈی' پرمسرت اور پرسکون سایہ دار جگہ کی آرزو کرنا لالچ نہیں ہے۔ زندگی کی منصوبہ بندی مرد بھی کرتے ہیں اور عورت بھی کرتی ہے۔"

نواز صاحب نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

نگاہوں کے تصادم سے عزت کچھ گڑبڑا سی گئی اور جلدی سے بولی۔ "ماجدہ کی کہانی سچی ہے عورت ہمیشہ وہیں جاتی ہے جہاں اسے خواب لے جاتے ہیں...."

نواز صاحب نے پتھر جیسے لہجے میں کہا۔ "اپنی حیثیت سے اونچے خواب دیکھنا حماقت

ہے۔ ایسی احمق عورتوں کے متعلق بدنامی کے راستے بڑی جلدی کھل جاتے ہیں۔"

پھر سیدھا دل پر آ کر لگا۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ ناصرہ نے کہا۔ "خواب ہمیشہ ہماری حیثیت سے اونچے ہوتے ہیں۔ اسی لئے چار سو روپے تنخواہ پانے والا ہزار روپے کی ملازمت تلاش کرتا ہے۔ وہ اس قابل ہے اس لئے تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح ایک خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکی جانتی ہے کہ وہ ایک اونچے گھر کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکتی ہے، اس ماحول کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔ اس لئے وہ جھونپڑی میں رہنے کے باوجود محلوں کے خواب دیکھتی ہے۔"

عزت آرا نے ذرا تلخی سے کہا۔ "ناصرہ صاحبہ! لڑکیاں ایسے خواب کیوں دیکھتی ہیں۔ یہ بھی نواز صاحب کو سمجھا دیجئے۔ خواتین کے رسالے کا اجراء کرنے سے پہلے ان کی نفسیات کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔"

نواز صاحب مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے وہ عزت کا مضحکہ اڑا رہے ہوں۔ انہوں نے کہا۔ "آپ ایک سیدھی سادی سی بات کو نفسیاتی پیچیدگیوں میں الجھانا چاہتی ہیں۔"

"جی نہیں!" عزت نے کہا۔ "یہ سیدھی سادی بات نہیں ہے۔ ہم عورتوں کی زندگی کا ایک الجھا ہوا اہم مسئلہ ہے کہ ہم خواب کیوں دیکھتی ہیں؟ اس لئے دیکھتی ہیں کہ ہمیں بچپن ہی سے دکھائے جاتے ہیں۔

"نانی اماں اور دادی اماں اپنی کہانیوں میں ہمیں ایک خوبصورت شہزادے کا تصور دیتی ہیں۔ ہمارا بچپن ان کے خوش رنگ محلوں میں گزرتا ہے۔ ہماری عمر کچی ہوتی ہے۔ ہمارا ذہن کچا ہوتا ہے مگر ہم ان محلوں میں بیاہ دی جاتی ہیں۔ ہمارا دل، ہمارا دماغ تو بہت پہلے ہی خوابوں کی سسرال میں قید ہو جاتا ہے۔ صرف ایک خالی خولی جسم بھٹکتا رہ جاتا ہے۔ جس کے لیے دانشور حضرات بدنامی کے راستے ہموار کرتے ہیں۔"

"واہ بہت خوب!" ناصرہ پروین نے تعریف کی۔ "عزت صاحبہ! آپ نے نفسیات کی روشنی میں عورت کی مظلومیت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔"

نواز صاحب نے عزت سے کہا۔ "آپ کی بات کسی حد تک درست ہے لیکن یہ بات تمام عورتوں پر صادق نہیں آتی۔ بہت سی عورتیں صابر ہوتی ہیں۔ انہیں جو کچھ اپنی

زندگی میں ملتا ہے اسے تقدیر سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں۔"

عزت نے جواب دیا۔ "میں ان عورتوں کی بات کر رہی ہوں جو اپنی ذہانت اور تعلیمی صلاحیتوں سے خوابوں کی تعبیر تک پہنچنے کی جدوجہد کرتی ہیں۔ ماجدہ کا المیہ یہی ہے کہ سراج کو اس کے آنسو متاثر نہیں کرتے لیکن ہم عورتوں کو متاثر کرتے ہیں کیونکہ ہم ٹوٹے ہوئے خوابوں کے کرب کو اچھی طرح محسوس کرتی ہیں۔ ایک مدیرہ کی حیثیت سے میرا فیصلہ ہے کہ اس کہانی کو ضرور شائع ہونا چاہئے۔"

نواز صاحب اس کے سامنے کہانی کا مسودہ پھینک کر کھڑے ہو گئے۔

مسودہ پھینکنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہے ہوں۔

"جہنم میں جاؤ....."

پھر وہ خود ہی وہاں سے چلے گئے۔

عزت خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی اور آہستہ آہستہ اپنے ہونٹوں کو چباتی رہی۔ اگر تنہائی میں وہ مسودہ اس کے منہ پر مار جاتے تو اسے تکلیف نہ ہوتی لیکن دوسری لڑکیوں کی موجودگی میں اسے اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔

ناصرہ پروین نے اس سے کہا۔ "آپ نے بہت ہی معقول جواب دیا ہے۔ نواز صاحب لاجواب ہو کر چلے گئے۔"

عزت نے ناگواری کا اظہار کیا۔ "اونہہ! پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟ بہت ہی خود پسند اور مغرور انسان ہیں۔ کیا لکھنے پڑھنے کی چیزوں کو اسی طرح پھینکا جاتا ہے؟"

ناصرہ نے مسکرا کر کہا۔ "کوئی سچائی کو مسکرا کر تسلیم کرتا ہے اور کوئی جھنجلا کر۔ بہرحال انہوں نے تسلیم کر لیا ہے۔"

فرزانہ فہیم مسودے کو سمیٹتی ہوئی بولی۔ "بیچارے عورتوں کو نہیں سمجھ پائے ہیں۔ اگر فیملی لائف گزارتے تو آج ایسی بحث نہ کرتے۔"

عزت نے فیصلہ سنا دیا۔ "ایسا شخص فیملی لائف نہیں گزار سکتا۔"

"کیوں نہیں گزار سکتا؟" فرزانہ نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ اس گھر میں اگر کوئی عورت کسی کام سے اوپری منزل کی طرف جائے گی تو وہ حضرت یہی سمجھیں گے کہ وہ اونچائی کے خواب دیکھ کر زینے چڑھ رہی ہے۔"

ناصرہ اور فرزانہ بے اختیار ہنسنے لگیں۔ پھر انہوں نے جلدی سے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لئے تاکہ دوسرے کمرے میں ہنسی کی آواز نہ جائے۔

دوسرے کمرے میں نواز صاحب اپنے دوست صفدر سے الجھ رہے تھے۔

"صفدر صاحب! آپ نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ کیا یہ خواتین کا رسالہ جاری کرنا ہمارے بس کی بات ہے؟ جہاں چار عورتیں ہم خیال ہو جاتی ہیں' وہاں اپنی ہی بات منوالیتی ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ اسمبلی میں انہیں ایک سے زیادہ سیٹ نہیں ملی ہے۔"

صفدر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ شادی کیجئے اور کسی کو اپنی عزت بنا کر گھر لے آیئے لیکن آپ ماہنامہ "عزت" کو ہر گھر کی زینت بنا رہے ہیں۔ ویسے تو یہ بہت نیک کام ہے لیکن خواتین کا رسالہ شائع کرنے کے لیے آپ کو خواتین کے نظریات سے متفق ہونا پڑے گا۔"

نواز احمد دانی ایک گہری سانس لے کر بولے۔ "ہاں! میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں ابھی ایک کہانی پر عزت آراء سے میرا اختلاف ہو گیا تھا۔ میں نے بحث کو طول نہیں دیا۔ وہ عزت کی مدیرہ ہیں۔ اگر کہانی قارئین کو پسند نہ آئی تو اس کی ذمہ داری ان پر ہی عائد ہو گی۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔"

صفدر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے نواز صاحب! آپ میں ایک اچھا خاوند بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ آپ عورتوں سے بحث کرنے کی بجائے انہیں طفلانہ تسلی دے کر مطمئن کر دیتے ہیں۔ کوئی بھی عورت ہو' آپ کے ساتھ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار سکتی ہے۔"

"آپ نے پھر وہی شادی کی بحث چھیڑ دی؟ بھئی کسی عورت سے شادی کرنا یا عورتوں کے لیے رسالہ شائع کرنا ایک برابر ہے۔ دونوں ہی معاملات میں عورتوں کے جذبات و احساسات کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ پہلے شمارہ کی محنت اور مصروفیتوں کے دوران مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے میں عزت سے شادی کر رہا.... مم.... میرا مطلب ہے.... مجھے یوں لگتا ہے جیسے ماہنامہ عزت سے میری ساری زندگی کا رشتہ ہو رہا ہے۔"

"وہ تو ہو ہی رہا ہے۔" صفدر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

نواز صاحب کچھ پریشان سے ہو کر ریوالونگ چیئر پر گھوم گئے اور کھڑکی کے باہر خلا تکنے لگے۔ زبان ذرا سی لڑکھڑا جائے تو کتنی پریشانی ہوتی ہے۔

وہ ماہنامہ عزت کہنا چاہتے تھے مگر بے خیالی میں صرف عزت کا نام آیا۔

بے خیالی ایک بے معنی سا لفظ ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کبھی خیال سے خالی نہیں ہوتا۔ پھر بے خیالی میں کوئی بات کیسے ہو سکتی ہے؟

نواز صاحب خلا میں گھورتے ہوئے بار بار اپنے ذہن کو کریدتے رہے کہ وہ نام ان کی زبان پر یونہی کیسے چلا آیا؟ کس چور دروازے سے چلا آیا؟

بڑی مصیبت ہے۔ انسان کو اپنے ہی اندر کے چور دروازے نظر نہیں آتے اور جب نظر نہیں آتے ہیں تو یہ سوچ کر خاموش رہنا پڑتا ہے کہ زندگی میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ ہی آپ زبان سے پھسل کر باہر آ جاتی ہیں۔

وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھے کھڑکی کی جانب سے گھوم گئے۔ سامنے میز کی دوسری طرف صفدر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"یہ ریوالونگ چیئر بڑی اچھی چیز ہے۔ انسان کو بیٹھے بیٹھے ادھر سے ادھر کر دیتی ہے۔ دیکھئے نا نواز صاحب ایک پھول کا نام بھی نرگس ہوتا ہے اور ایک لڑکی کا نام بھی نرگس ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نرگسی پھول کھلنے کا ذکر ہو تو ذہن میں آپ ہی آپ کسی اور نرگس کا چہرہ کھل جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور وہاں سے جانے کے لیے اٹھ گئے۔

نواز صاحب نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کے انداز میں کہا۔ "دیکھئے صفدر صاحب! آپ میرے متعلق غلط رائے قائم کر رہے ہیں۔ آپ میری سوچ کو ایک ایسی لڑکی سے منسوب کر رہے ہیں جو ہمیشہ اسکینڈل کا شکار رہتی ہے۔ تعجب ہے کہ ایسا مذاق کرتے وقت آپ میرے معیار کو بھول گئے ہیں۔"

صفدر صاحب ذرا سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے نواز صاحب کو گہری نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "جھوٹ اور سچ کے درمیان جو بات اٹک کر رہ جاتی ہے' اسے اسکینڈل کہتے ہیں۔ اگر آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ عزت آراء کے متعلق جو افواہیں ہیں وہ بالکل سچ ہیں تو آپ کبھی انہیں مدیرہ کی حیثیت سے منتخب نہ کرتے۔ آپ کے انتخاب سے آپ کے

معیار کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

"یہ ایک الگ سی بات ہے کہ سچ اور جھوٹ کے درمیان ایک کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ اس کانٹے کو نکال پھینکنا اور حقیقت کو سمجھنا ہمارا اور آپ کا فرض ہے کیونکہ عزت آراء اب ہمارے ادارے کی عزت ہیں۔ ان کی ہی صلاحیتوں سے ماہنامہ "عزت" کا وقار بلند ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دفتر سے باہر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی نواز احمد درانی بہت آہستہ آہستہ ریوالونگ چیئر پر گھوم گئے اور کھڑکی سے باہر خلا میں تکنے لگے۔ ریوالونگ چیئر واقعی بہت اچھی چیز ہے۔ انسان بیٹھے بیٹھے ادھر سے ادھر' نرگسی پھول سے نرگسی چہرے تک' پہنچ جاتا ہے۔

☆============☆============☆

عورت اپنی فطرت سے مجبور ہے جب تک کوئی مرد حاکم بن کر اس کی زندگی میں نہیں آتا اس وقت تک اس کی نسائیت بے قرار رہتی ہے۔

شبنم کی عید ہو گئی۔

جب سے آمنہ بوا نے آکر بتایا تھا کہ فرہاد اس کے دیئے ہوئے پتہ پر ملازمت کے لیے جائے گا' اس وقت سے ہی وہ مارے خوشی کے دیوانی ہوئی جارہی تھی۔

وہ پچھلی رات ہی سوسائٹی والی کوٹھی میں آگئی تھی کیونکہ اس نے فرہاد کو اسی کوٹھی کا پتہ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ برسوں سے نوکری کی تلاش میں بھٹکنے والا ملازمت حاصل کرنے کے لالچ میں ضرور اس کے پاس آئے گا۔

وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ فرہاد بدنامی کے خیال سے اپنے محلے میں اس سے ملاقات نہیں کرے گا۔ اسی لئے اس نے چارہ ڈال کر اسے کوٹھی میں بلایا تھا۔

وہ کوٹھی کرائے پر اٹھادی گئی تھی لیکن کرایہ دار پچھلے دو ماہ سے خالی کر کے چلا گیا تھا۔ وہ پچھلی رات سے ایک ملازمہ کو لے کر ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کا سامان درست کر رہی تھی۔ بستر کی چادریں بدلی جارہی تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر نئے پردے لگائے جارہے تھے۔

ملازمہ کارپٹ کلینر سے قالین صاف کرتی رہی۔ تمام فرنیچر کو جھاڑ پونچھ کر چمکاتی رہی۔ شبنم کھانے کی فہرست بنانے میں رات گئے تک مصروف رہی۔

ملازمہ نے پوچھا۔ "بی بی جی! کوئی نئے کرایہ دار آرہے ہیں؟"

"نہیں!"

"مہمان آرہے ہیں؟"

"مہمان!" شبنم آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔ ہاں' وہ میرے دل کا مالک ہے مگر مہمان بن کر آرہا ہے۔

ملازمہ اسے خیالوں میں گم ہوتے دیکھ کر سونے چلی گئی۔ بہت رات گزر گئی تھی لیکن شبنم کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔ اس کی ہر

کروٹ پر فرہاد سامنے آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔

اس کی راتوں میں بہت سے لوگ آئے تھے مگر خیالوں کے شبستان میں ایک ہی مرد تھا۔ فرہاد!

اس کے دل میں کسی گناہ کا شوق نہیں تھا۔ گناہ آلود زندگی نے اسے تھکا دیا تھا۔ وہ اپنے ماضی سے خود ہی نفرت کرنے لگی تھی۔ زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان خود بخود توبہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

وہ توبہ کا راستہ اختیار کر رہی تھی۔

اس نے محلے کی ایک مسجد کی تعمیر کے لیے ہزاروں روپے دیئے' یتیم خانوں اور فلاحی اداروں میں بھی چندہ دیتی رہی۔ اس نے محلے کے گلی کوچوں کو غلاظت سے صاف کرایا۔ بھوکوں اور بے روزگاروں کے کام آتی رہی۔ اس نے ہر وہ کام کئے جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ خدا کو خوش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ وہ رحمان و رحیم ہے۔ بندوں کی ایک ذرا سی نیکی سے خوش ہو کر معاف کر دیتا ہے۔

لیکن انسان' انسان کو معاف نہیں کرتا۔

وہ گناہگار تھی اس لئے لوگ اسے گناہگار ہی سمجھتے تھے۔ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ بری سے بری عورت میں بھی نیکی اور پاکیزگی کا شوق پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ دنیا ایک بار جسے گنہگار کہتی ہے' ساری زندگی اسے بدنام کرتی رہتی ہے۔

شبنم کو دنیا والوں کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ خدا کے بعد صرف فرہاد کے دل میں جگہ بنانا چاہتی تھی۔ وہ اسے گاہک کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے مالک و آقا کی حیثیت سے قبول کرنا چاہتی تھی۔

عورت اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ جب تک کوئی مرد حاکم بن کر اس کی زندگی میں نہیں آتا' اس وقت تک اس کی نسائیت بے قرار رہتی ہے۔ خواہ اس کی زندگی میں سینکڑوں چاہنے والے آجائیں لیکن اسے آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔

کوئی ایسا ہو جو اس پر حکومت کرے۔ اس کے دل پر' اس کے دماغ پر اور اس کی روح پر چھا جائے۔ وہ سوچے تو اپنے مرد کے ذہن سے سوچے۔ بولے تو اپنے مرد کی زبان سے بولے۔ ایسے ہی مرد کی بانہوں میں زندگی ملے اور ایسے ہی مرد کے قدموں میں موت

نصیب ہو۔

اور فرہاد ایسا ہی آئیڈیل تھا۔

شبنم نے جب سے اسے دیکھا تھا' تب ہی سے اس کے اندر کی عورت بیدار ہو گئی تھی اور وہ بڑی دیانتداری سے اپنا ایک چھوٹا سا گھر بسانے کی تمنا کر رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا گھر' جس میں وہ فرہاد کے لیے کھانا پکائے گی' اس کے لیے بستر بچھائے گی' اس کے پاؤں دبائے گی۔ فرہاد سے ہونے والے بچے اس گھر کے آنگن میں کھیلیں گے اور ماں باپ کی گود میں خوش رنگ پھولوں کی طرح کھلتے رہیں گے۔

کتنی چھوٹی سی' کتنی معمولی سی آرزو تھی۔ یہ آرزو اس کی دولت سے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ فرہاد کی محبتوں اور عنایتوں سے ہی اس گھر کی جنت کے دروازے کھل سکتے تھے۔

وہ تمام رات بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ کبھی سوتی رہی' کبھی جاگتی رہی اور سوتے جاگتے سوچ نگر کی راہوں میں فرہاد کے پیچھے بھاگتی رہی۔

دوسرے دن اس نے پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ شام تک اس کی عجیب سی حالت ہو گئی تھی۔ کبھی وہ دروازے پر آ کر فرہاد کا انتظار کرتی تھی۔ کبھی ڈرائنگ روم اور بیڈ روم میں آ کر ہر چیز کا جائزہ لیتی تھی اور کبھی آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سنگھار کو دیکھتی تھی۔

آج اس نے کسی غیر کے لیے سنگھار نہیں کیا تھا۔ نہ کسی کو لبھانا تھا اور نہ ہی کسی کو گاہک بنانا تھا۔ اسی لئے آج اس کے چہرے پر غازہ اور ہونٹوں پر سرخی نہیں تھی۔ صرف آنکھوں میں کاجل تھا۔ اپنی دولت کی نمائش کے لیے اس نے سونے کے زیورات نہیں پہنے تھے' صرف کانوں میں بندے اور ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ لباس بھی بھڑکیلا نہیں تھا لیکن اس کا صحت مند جسم ایسا بھڑکیلا تھا کہ سفید ساڑھی اور بلاؤز میں بھی نگاہوں کو گرما دیتا تھا۔

ٹھیک سات بجے ملازمہ نے اطلاع دی کہ فرہاد صاحب آ گئے ہیں۔

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔" فرط مسرت سے اس کی آواز لرزنے لگی۔

اسے فرہاد کے استقبال کے لیے آگے بڑھنا چاہئے تھا۔ اس نے پہلے سے سوچ رکھا تھا

کہ فرہاد آئے گا تو وہ کس طرح مسکرا کر اس کا استقبال کرے گی اور کتنے میٹھے انداز میں اس سے گفتگو کرے گی۔ لیکن اس کی آمد کی اطلاع پاتے ہی وہ سب کچھ بھول گئی۔

رسمی جملے اور رسمی ادائیں اس وقت یاد آتی ہیں جب کسی کو اپنے دام میں پھنسانا مقصود ہو لیکن آج اس نے کوئی جال نہیں بچھایا تھا بلکہ خود ہی فرہاد کے جال میں الجھنا چاہتی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس آئی اور اسے ذرا سا کھول کر جھانکنے لگی۔

ڈرائنگ روم میں فرہاد نظر آ رہا تھا۔ ایش کلر کی پتلون اور کریم کلر کی شرٹ میں وہ پہلے سے زیادہ جاذب نظر ہو گیا تھا یا پھر شبنم کی نظروں میں ہی پیار کی اتنی خوبصورتیاں سما گئی تھیں کہ فرہاد اسے ہر اعتبار سے مکمل نظر آ رہا تھا۔ صرف فرہاد ہی نہیں' آج اس کے آتے ہی شبنم کو اپنا گھر بھی مکمل نظر آ رہا تھا۔

وہ صوفہ کے قریب کھڑا ہوا تھا اور صوفہ پر بیٹھتے ہوئے جھجک رہا تھا کیونکہ وہ اسے کسی بڑے آفیسر کی کوٹھی سمجھ کر آیا تھا۔ اس آفیسر سے ملے بغیر اور اس کی اجازت کے بغیر کیسے بیٹھ سکتا تھا۔

ملازمہ نے کہا۔ "بیٹھ جائیے!"

وہ جھجکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ ایک ملازمہ کے کہنے پر اسے بیٹھنا چاہئے یا نہیں۔ شبنم دروازے کی آڑ سے مسکراتی ہی۔

ملازمہ نے دوبارہ کہا۔ "آپ تکلف نہ کریں۔ یہ آپ کا ہی گھر ہے۔ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔ آپ اطمینان سے یہاں تشریف رکھیں۔"

یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

وہ ہچکچاتے ہوئے صوفہ کے سرے پر بیٹھ گیا۔

دروازے کے پیچھے شبنم کا دل دھڑکتا رہا۔ وہ سامنا کرنے سے پہلے اپنی گھبراہٹ اور اپنی خوشیوں پر ایک ذرا قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنی ساڑھی کو اچھی طرح اپنے سینے پر سے لے جا کر شانے پر سے گزار کر اس کے آنچل کو سر پر رکھ لیا۔ وہ اپنے مجازی خدا کے سامنے ننگے سر نہیں جا سکتی تھی۔

وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

فرہاد نے اسے آتے ہوئے نہیں دیکھا کیونکہ وہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

شبنم دو قدم آگے بڑھتی پھر جھجک کر' شرما کر رک جاتی تھی۔ صوفوں کے قریب پہنچ کر اس نے بدقت لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"آداب!"

فرہاد ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ عورت کی آواز سن کر پہلے تو اس نے یہی سمجھا تھا کہ آفیسر کی کوئی عزیزہ ہے۔ پھر شبنم پر نظر پڑتے ہی وہ حیران رہ گیا۔

"تم؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

شبنم نے سر کو جھکا لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ فرہاد کی حیرانی کا کیا جواب دے۔ اس نے پھر پوچھا۔

"کیا تم میری سفارش کرنے آئی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر تمہاری موجودگی کا کیا مطلب ہے؟"

شبنم کے دل کو ٹھیس لگی۔ فرہاد کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ پتھر مار کر پوچھ رہا ہو کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ یہاں سے چلی جاؤ۔

وہ غمزدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "کیا میری موجودگی آپ پر گراں گزر رہی ہے؟"

"ہاں! میں اپنی امی اور بہن کے اصرار پر تمہارا احسان قبول کرتے ہوئے یہاں آیا ہوں۔ اگر میں اس دنیا میں تنہا ہوتا اور بوڑھی ماں اور جوان بہن کی ذمہ داریاں مجھ پر نہ ہوتیں تو میں یہ احسان کبھی نہ اٹھاتا۔ میرے حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے لیکن اتنا بھی مجبور نہیں ہوں کہ اپنی صلاحیتوں کے بل پر ملازمت حاصل کرنے کی بجائے تمہاری سفارش کے ذریعہ ملازمت حاصل کروں۔"

وہ دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ٹوٹے ہوئے دل سے پوچھا۔

"کیا تم مجھ سے نفرت کرتے ہو؟"

فرہاد ذرا دیر کے لئے چپ رہا اور اسے دیکھ کر سوچتا رہا کہ کیا جواب دینا چاہئے۔

نفرت تو وہ کرتا تھا مگر یہ پرانی بات تھی۔ اب وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے نفرت کرنا چاہئے یا نہیں۔ کیونکہ اپنے محلے میں اس نے شبنم کو ہمیشہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرتے دیکھا تھا۔

اور اس وقت جو شبنم اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی' وہ خالص مشرقی عورت نظر آ رہی تھی۔ سر پر آنچل' حیا سے جھکی ہوئی پلکیں' چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ دور دور تک کسی گناہگار عورت کا سراغ نہیں ملتا تھا۔

سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں وہ اتنی سیدھی سادی اور فرشتہ صفت عورت نظر آ رہی تھی کہ فرہاد نفرت کا اظہار نہ کر سکا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

"پھول کو حاصل کرنے والے کانٹوں سے نفرت نہیں کرتے' صرف ان کانٹوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں تم سے نفرت نہیں کرتا بلکہ تم سے بچ کر ملازمت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ مجھ سے دامن کیوں بچانا چاہتے ہیں؟"

"اس لئے کہ تمہارے قریب بدنامیاں ہیں۔"

"کیا تم ایک کمزور عورت کو بدنامیوں سے نہیں بچا سکتے؟"

"میں....؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "میں تمہیں کس طرح بدنامیوں سے بچا سکتا ہوں؟ جو تم نے بویا ہے وہ کاٹ رہی ہو۔"

"نہیں!" شبنم نے جواب دیا۔ "جو میں نے بویا تھا' وہ کاٹ چکی ہوں۔ انسان کی زندگی میں بونے اور کاٹنے کے بے شمار مواقع آتے ہیں۔ اب کی دفعہ میں نیکی بونا اور نیکی کی فصل کاٹنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے میں اب تک تنہا جدوجہد کرتی آ رہی ہوں۔ کیا اس نیک کام میں تم میری مدد نہیں کرو گے؟"

وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا کہ اس کی باتوں میں کہاں تک صداقت ہے۔

صداقت ضرور تھی۔ فرہاد نے اسے ایک ہمدرد اور رحمدل عورت کے روپ میں دیکھا تھا۔ اسے دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہوئے اور تن من دھن سے ان کے کام آتے دیکھا تھا۔ ویسے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی برائیوں پر پردہ ڈالنے کے

لیے اوپر سے شریف اور پارسا بن جاتے ہیں۔ بظاہر دوسروں سے نیکی کرتے ہیں لیکن درپردہ اپنی عادت کے مطابق گناہ آلود زندگی گزارتے ہیں۔

شبنم بھی اپنی پرانی عادتوں سے مجبور ہو سکتی ہے۔ فرہاد اس کی جانب دیکھ کر سوچنے لگا۔ سامنے کھڑی ہوئی شبنم نگاہوں میں سمائی جا رہی تھی۔ اوپر سے دیکھو تو کوئی کھوٹ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے حسن میں ایسی دلکشی تھی کہ سیدھی دل پر آکر دستک دیتی تھی۔

اب نہ جانے وہ اندر سے کیسی ہوگی؟ انسان کو تو اوپر سے نہیں' اندر سے بدلنا چاہئے۔ اب کوئی اس کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ گناہ سے واقعی توبہ کر چکی ہے یا نہیں؟

فرہاد نے سر جھکا کر کہا۔ "یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم نے نیکی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس راستہ پر تمہارا ساتھ دینے والے بہت سے لوگ مل جائیں گے میری بھی نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "سب ہی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ کوئی اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہے اور کوئی دعائیں دیتا ہے۔ لوگ بڑی بڑی تسلیاں دے کر کترا جاتے ہیں۔ آپ بھی میرے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں۔"

"میں مجبور ہوں۔ تم سے صرف زبانی ہمدردی کر سکتا ہوں کیونکہ تمہارے ساتھ بدنامیاں ہیں۔ اگر کسی نے مجھے تمہارے قریب دیکھ لیا تو یہ بدنامیاں میرے گھر تک پہنچ جائیں گی اور تم جانتی ہو کہ میرے گھر میں ایک جوان بہن ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ اسی لئے آپ کا سہارا تلاش کر رہی ہوں کیونکہ آپ بدنامیوں کے زخم کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔ آپ کی بہن اتنی پیاری اور نیک سیرت ہے پھر بھی دنیا والے ان کی نیکیوں کی قدر نہیں کرتے۔ بروں کو بھی بدنام کرتے ہیں اور اچھوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ آپ دنیا والوں کا کیا بگاڑ لیں گے؟ کچھ نہیں' آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ احمقوں سے الجھنے سے بدنامی اور بڑھتی ہے۔ دانش مندی یہی ہے کہ ہم نیکی اور شرافت کے راستے پر خاموشی سے چلتے رہیں اور جھوٹی باتیں پھیلانے والوں سے ہمیشہ کتراتے رہیں۔

"ان سے کترانے کے لیے ہی میں نے آپ سے یہاں ملاقات کی ہے۔ میں نہیں

چاہتی تھی کہ آپ مجھ سے اس محلے میں ملاقات کریں اور اس طرح میری بدنامی آپ کے ساتھ آپ کی بہن تک پہنچ جائے۔ آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ میں آپ لوگوں کی عزت کا کتنا خیال رکھتی ہوں۔"

فرہاد ایک گہری سانس لے کر صوفہ پر بیٹھ گیا۔ ملازمہ چائے اور ناشتہ کی ٹرالی رکھ کر جا رہی تھی۔

شبنم نے اس سے کہا۔ "کسی کا فون آئے تو کہہ دینا میں گھر میں نہیں ہوں۔"

"جی اچھا!" وہ چلی گئی۔

فرہاد نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ تمہاری کوٹھی ہے؟"

"جی ہاں!" وہ اس کے قریب ایک صوفہ پر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

فرہاد نے کہا۔ "ہوں! تو تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں آپ کو کبھی دھوکہ دینے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ ملازمت کی تلاش میں آئے ہیں۔ آپ کو ملازمت ضرور ملے گی۔ اگر آپ مجھے کسی قابل سمجھ کر میرا مشورہ قبول کریں تو میں کچھ اور مشورہ دینا چاہتی ہوں۔"

اس نے پیسٹری کی ایک پلیٹ آگے بڑھائی۔

فرہاد نے کہا۔ "شکریہ میں صرف چائے پینا چاہتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ کون سا مشورہ دینا چاہتی ہو۔"

"یہی کہ آپ ملازمت نہ کریں۔ ملازمت میں بندھی بندھائی آمدنی ہے۔ آپ کوئی اچھا سا کاروبار کیجئے۔"

"کاروبار کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں گا؟"

"پارٹنر شپ میں بزنس کرنے کے لیے آپ کو پیسوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دوسروں کا پیسہ ہوگا اور آپ کی محنت ہوگی۔"

"میری محنت پر بھروسہ کر کے کون اپنی دولت ضائع کرے گا؟"

"آپ ضائع ہونے کے متعلق کیوں سوچتے ہیں۔ کاروبار ایک جواء ہے۔ اس میں نقصان بھی ہوتا ہے اور نفع بھی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ جو کام نیک نیتی سے کیا جائے

اس میں نقصان نہیں ہوتا۔"

اس نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ وہ پیالی لیتے ہوئے بولا۔ "یہی تو سب سے اہم سوال ہے کہ میری نیک نیتی پر اعتماد کون کرے گا؟"

"میں کروں گی!"

"تم!" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "یعنی کہ تم پارٹنر شپ میں بزنس کرو گی؟"

"ہاں! اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ میں نے آج سے پہلے کبھی کوئی کاروبار نہیں کیا۔ میں ایک ناتجربہ کار آدمی ہوں اور تم پارٹنر بن کر اپنی دولت ضائع کرنا چاہتی ہو۔ آخر تمہیں مجھ پر اتنا اعتماد کیوں ہے؟"

شبنم تھوڑی دیر تک سر جھکائے پیالی میں چمچہ کو ہلاتی رہی۔ اپنی زندگی کی پیالی میں مٹھاس گھولتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔

"میں عورت ہوں۔ کسی ایک شخص پر اعتماد کئے بغیر پرسکون زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں تنہا محفوظ نہیں رہ سکتی۔ میری دولت کو دیکھ کر بہت سے لوگ اپنی محبت اور دیانت داری کا یقین دلا سکتے ہیں۔ لیکن میں کسی پر یقین نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں بہت ٹھوکریں کھا چکی ہوں۔

"آپ ایک شریف خاندان کے فرد ہیں۔ جانے کیوں میں دل سے آپ پر اعتماد کرنے لگی ہوں۔ شاید اس لیے کہ آپ نے میرے حسن اور میری دولت سے متاثر ہو کر کبھی میرے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ آپ کی بہن کی معصومیت اور اس کے ساتھ ہونے والی فضول بدنامیوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ آپ لوگ میری طرح زخم خوردہ ہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میں آپ پر کیوں اعتماد کرتی ہوں۔ آپ اسے اندھا اعتماد سمجھ لیجئے۔ میں اپنے دل سے مجبور ہو کر آپ کو پارٹنر بنانا چاہتی ہوں۔"

شبنم روانی میں بولتی چلی گئی۔ روانی ایسی تھی کہ وہ بے خیالی میں اپنے دل کی کمزوری بیان کرتی چلی گئی۔ وہ یہ سمجھ نہ سکی کہ دل سے مجبور ہو کر کسی کو پارٹنر بنانے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

فرہاد نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور آہستگی سے کہا۔ "کاروبار میں دل سے نہیں

دماغ سے کام لیا جاتا ہے۔ تم نے کاروبار کا مسئلہ چھیڑ کر مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ مجھے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے تو یہ سوچنا ہوگا کہ کاروباری تعلقات کی وجہ سے ہمارے آپس کے تعلقات بڑھیں گے' پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ وہی بدنامی۔

"تم مجھ پر اندھا اعتماد کر رہی ہو۔ اس لیے میں بھی اپنی بدنامی کی کبھی پروا نہ کرتا لیکن ہماری وجہ سے ایک جوان بہن کی بدنامیوں میں اضافہ ہو جائے گا۔"

شبنم نے کہا۔ "میں آپ کی بہن کو بدنام نہیں ہونے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے میں اس محلے کو چھوڑ دوں گی اور اسی کوٹھی میں رہا کروں گی۔ ہماری ملاقاتیں بھی یہاں ہوا کریں گی۔ یہ اتنا بڑا علاقہ ہے کہ کوئی ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ کوئی آپ کے متعلق یہ نہیں پوچھے گا کہ آپ کون ہیں اور یہاں کیوں آتے ہیں؟

"میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ کسی دوسرے علاقہ میں چلے جائیں۔ کراچی اتنا بڑا شہر ہے کہ بدنامی پیچھا کرتے کرتے تھک جاتی ہے۔ نئی جگہ کوئی آپ لوگوں کو نہیں جانتا ہوگا۔ وہاں آپ ایک نئی اور بے داغ زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔"

فرہاد نے چائے کی پیالی ٹرالی میں رکھ دی اور اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ شبنم نے کہا۔ "سوچنے کے لیے ابھی بہت وقت ہے۔ آیئے میں آپ کو اپنی کوٹھی دکھاؤں۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

فرہاد ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ سگریٹ کا ایک کش لینے کے بعد وہ بھی کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے وقت شبنم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے قد سے بہت اونچی ہو گئی ہے۔ پہلے وہ بہت چھوٹی سی تھی' حقیر سی تھی' ایک ادھوری عورت تھی' آج ایک مرد اس کے قریب آکر اسے مکمل کر رہا تھا۔

☆===========☆===========☆

وہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک عورت ہے مگر ایک ٹھوس مجسم ہستی نہیں ہے بلکہ تخیل کی دلکشی ہے۔ ایک شعر کا دھڑکتا ہوا مفہوم ہے ایک مغنی کی سحر انگیز آواز ہے جسے نواز صاحب سن سکتے ہیں مگر کسی آنچل کی طرح پکڑ نہیں سکتے۔

ماہنامہ "عزت" کا پہلا شمارہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کا سیٹ اپ اور گیٹ اپ ایسا حسین اور مکمل تھا جیسے ڈال ڈال پات پات خوشبوؤں کو سمیٹ کر گلدستہ بنا دیا گیا ہو۔

دن رات کی محنتوں اور کاوشوں کا انعام مل گیا۔ دوسرے ہی شمارے میں اس کی اشاعت پندرہ سے بیس ہزار ہو گئی۔ پھر یہ تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ اس پر محنت سب ہی کی تھی۔ اس پر سب ہی کی قلمی صلاحیتوں کا پرتو تھا مگر عزت آراء کا نام سرفہرست تھا کیونکہ وہ مدیرہ تھی۔ ایک منجھی ہوئی معروف مصنفہ تھی۔ اس کی تحریر میں کنوارے جذبوں کی لطافت بھی تھی اور زخمی حسرتوں کا سوز و گداز بھی۔ خوابوں کے محلوں کی بھول بھلیاں بھی تھیں اور زندگی کی زہریلی کاٹ بھی۔ وہ معاشرے کی غلاظتوں کو الفاظ کی خوشبوؤں میں بسا کر پیش کرنے کا سلیقہ جانتی تھی' اس لئے اس کا نام آپ ہی آپ سب کی زبان پر چڑھتا چلا گیا۔

رسالے کی تعداد بڑھی' نام بڑھا تو ساتھ ہی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔ ناصرہ پروین اور فرزانہ فہیم اپنے کاموں سے نمٹ کر شام ہی کو دفتر چھوڑ دیتی تھیں لیکن عزت کا کام دفتری اوقات کے بعد بھی جاری رہتا۔ آخری کاپی پریس میں جانے تک اس کی موجودگی لازمی ہوتی۔ ایک مدیرہ کی حیثیت سے صفحات کی ترتیب اور سیاق و سباق کے تسلسل پر نظر رکھنے کے لیے اسے آخری مرحلہ تک دفتر ہی میں رہنا پڑتا تھا۔

عزت نے ایک آدھ بار اعتراض کیا کہ وہ دفتری اوقات کے بعد نہیں رہے گی۔ اعتراض کام کی زیادتی پر نہیں تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ اندھیرا ہونے کے بعد وہ تنہا رکشہ یا ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر نہیں جا سکتی تھی۔ گھر بھی دنیا کے آخری سرے پر تھا۔ دفتر سے پچیس میل دور تھا۔ راستے میں کچھ ایسے ویران مقامات بھی آتے تھے جہاں سے گزرتے وقت کلیجہ ہول جاتا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب مہینہ بھر کی تنخواہ اس کے وینٹی بیگ میں موجود ہوتی۔ جان کا خطرہ' مال کا خطرہ اور عزت کا بھی خطرہ۔ کوئی کیا جانے کہ

ایک مدیرہ کتنے خطرات سے گزر کر ایک خوبصورت جریدہ کی تخلیق کرتی ہے۔

آٹھویں شمارے کے آخری مرحلہ پر پھر اس نے اعتراض کیا۔ نواز صاحب اور صفدر صاحب نے سمجھایا کہ کام زیادہ نہیں ہے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔

سمجھانے کو تو انہوں نے سمجھا ہی لیا تھا لیکن اپنی مصروفیتوں اور الجھنوں میں یہ بھول گئے کہ سردی کا موسم ہے۔ پانچ بجتے ہی اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ عورت کے سنگھار میں اتنا وقت نہیں لگتا جتنا کہ پرچہ کی آرائش میں لگ جاتا ہے۔ آرائش مکمل ہوئی تو رات کے نو بج گئے تھے۔

"میں اتنی رات کو تنہا کیسے جاؤں؟" عزت آراء نے پریشان ہو کر کہا۔

نواز صاحب نے کہا۔ "میری کار میں صدر تک چلئے۔ وہاں سے آپ کو ٹیکسی مل جائے گی۔"

"کیا ٹیکسی میں تنہائی نہیں ہوگی؟" صفدر صاحب نے کہا۔ "آپ بھی عجیب ہیں نواز صاحب۔ ٹیکسی تو کہیں بھی مل سکتی ہے۔ آپ عزت صاحبہ کی پریشانیوں کو سمجھیں۔ وہ اتنی رات کو تنہا سفر نہیں کر سکتیں۔ دفتری کاموں کی وجہ سے انہیں دیر ہو گئی ہے۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ انہیں گھر تک پہنچا کر آئیں۔"

"میں....؟" انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

ان کی نظریں بے اختیار عزت آراء کی جانب اٹھیں۔ عزت آراء نے فوراً ہی نظروں کے درمیان پلکوں کی چلمن ڈال دی۔

"جی ہاں' آپ!" صفدر صاحب نے کہا۔ "ہم سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ ہم سب ایک خاندان' ماہنامہ "عزت" کے خاندان کے افراد ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد ہے۔ اگر اعتماد نہیں ہے تو بے شک آپ انہیں گھر پہنچانے سے انکار کر سکتے ہیں۔"

عزت آراء نے کہا۔ "صفدر صاحب' آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ میں جبراً کسی کا احسان نہیں لینا چاہتی۔"

صفدر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "جبر تو اس وقت ہوگا جب نواز صاحب انکار کریں اور میں انہیں مجبور کروں۔ بھئی مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا ہوں۔ اب آپ دونوں جو

مناسب سمجھیں وہی فیصلہ کریں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے پریس میں جانے والی کاپیوں کو اٹھایا اور دفتر سے باہر چلے گئے۔

عزت آراء اور نواز احمد درانی تھوڑی دیر تک تنہا اور خاموش رہے پھر نواز صاحب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "صفدر صاحب نے اعتماد والی بات کہی ہے' میں اپنے ادارے میں بے اعتمادی کی فضا پیدا نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی آپ پر احسان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ اس لئے میں آپ کو گھر تک پہنچا کر آؤں گا۔ آیئے۔"

وہ آگے بڑھ کر دفتر سے باہر جانے لگے۔

عزت آراء کو طیش آگیا۔ کیسی بے نیازی دکھا گئے تھے۔ کبھی مسکرا کر بات کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ اگر صفدر صاحب ایک دوسرے کو اعتماد قائم رکھنے پر نہ اکساتے تو شاید انہیں اپنا فرض بھی یاد نہ آتا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگی۔ اس وقت وہ بہت مجبور تھی۔ نہ دفتر میں رات گزار سکتی تھی اور نہ ہی کسی ٹیکسی ڈرائیور پر اعتماد کر سکتی تھی۔ نواز صاحب کی بات کچھ اور تھی۔ ان سے لاکھ شکایتیں سہی مگر اس وقت وہی ایک قابل اعتماد آدمی تھے۔ شریف آدمی کی یہی پہچان ہوتی ہے۔ دشمن نظر آنے کے باوجود اپنا اپنا سا لگتا ہے۔

وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی دفتر کی عمارت سے باہر آئی۔ ارادہ یہی تھا کہ چپ چاپ پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ جائے گی اور ایک اجنبی کی طرح پچیس میل کا سفر طے کرے گی۔ لیکن کار کے قریب آکر پتہ چلا کہ پچھلی سیٹ پیک اپ ہو چکی ہے۔

صفدر صاحب' سرکولیشن منیجر اور ہیڈ کاتب وہاں پہلے سے ہی براجمان تھے۔ نواز صاحب ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ عزت آراء کو دیکھ کر انہوں نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

عزت آراء کا غصہ ذرا سا ڈھل گیا۔ اس لئے نہیں کہ انہوں نے اپنے ساتھ والی سیٹ آفر کی تھی بلکہ اس لئے کہ انہوں نے ایٹی کیٹ کا خیال رکھتے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ وہ ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی اور دروازے کو بند کر دیا۔

صفدر صاحب ڈان پریس کے سامنے اتر گئے۔ سرکولیشن منیجر اور ہیڈ کاتب' صدر تک آکر رخصت ہو گئے۔ کیونکہ انہیں دوسرے روٹ پر جانا تھا۔ ڈرگ کالونی جانے کے لیے

دو تنہا مسافر رہ گئے۔

وہ دونوں خاموش تھے۔

وہ ندی کے دو کناروں کی طرح ایک ہی سیٹ کے دو سروں پر دور دور بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کار کے انجن کی بہت ہی مدہم سی آواز گنگنا رہی تھی۔ کوئٹہ کی برفانی ہوا سے بچنے کے لیے کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیئے گئے تھے۔

وہ کار نہیں تھی۔ بند کمرہ تھا۔ شیشوں کے قفس میں بھینی بھینی خوشبو جاگ رہی تھی۔ نواز صاحب سینٹ لگانے کے عادی تھے۔ جیسے ریگستان کے بنجر سینے میں اچانک کہیں نخلستان نظر آ جاتے ہیں۔ اسی طرح نواز صاحب کے روکھے پھیکے وجود سے زندگی کی خوشبو ہمک رہی تھی۔

خاموشی سے کیا ہوتا ہے؟ ہزار خاموشی کے باوجود انسان خوشبو کی زبان سے بہت کچھ بول دیتا ہے۔

عزت آراء نے بڑے محتاط انداز میں آہستگی سے سانس کھینچی۔ مرکیولنڈی کی گدگداتی ہوئی مہک اس کے حساس نتھنوں سے سرسراتی ہوئی سیدھی دل میں اتر گئی۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چوری پکڑی گئی ہے۔ وہ آپ ہی آپ بدن چرانے لگی۔ ذرا اور کھسک کر دروازے سے چپک گئی۔ دوپٹے کو اِدھر اُدھر سے کھینچ تان کر یوں پردہ کرنے لگی جیسے چرائی ہوئی خوشبو کو چھپا رہی ہو۔

چھپانے سے کیا ہوتا ہے؟ ہزار پردہ پوشی کے باوجود جھجکتے ہوئے جسم کی بے کلی اور اداؤں کی کھلتی ہوئی کلی رہ رہ کر چغلی کھاتی ہے۔

کار تیزی سے بھاگتی جا رہی تھی۔ دکانوں کی روشنیاں ان کے چہروں سے پھسلتی ہوئی گزر رہی تھیں اور کار کے اندرونی ماحول کو اور زیادہ تاریک اور پراسرار بنا رہی تھیں۔

عجیب خاموشی تھی۔ کوئی زبان سے نہیں پھوٹ رہا تھا۔ کیسے ضدی تھے ان کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ارے کچھ خوشبو کی باتیں کرو۔ کچھ موسم کی باتیں کرو۔ اور کچھ نہیں تو ماہنامہ "عزت" کو ہی گفتگو کا موضوع بنا ڈالو۔ اب تو اس کی اشاعتی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ اگر پچاس ہزار تک گنتی نہیں آتی ہے تو کم از کم پچاس تک ایک دوسرے کو گنتی سنا ڈالو۔

لعنت ہے ایسی خاموشی پر۔ ارے آدھے سے زیادہ سفر طے ہو چکا ہے، تنہائی کے خوبصورت لمحات ضائع ہو رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب سے پیدا ہوئے ہیں اس وقت سے بولنا ہی نہیں سیکھا ہے۔

نواز صاحب نے بور ہو کر ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔

ریڈیو سے کوئی ڈرامہ نشر ہو رہا تھا۔ سوئچ آن ہوتے ہی کسی مرد کی جذباتی آواز سنائی دی۔

"ہائے!"

عزت آراء نے چونک کر نواز صاحب کی جانب دیکھا۔ اسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے انہوں نے "ہائے" کی ہے مگر وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہے تھے۔

پھر کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "بڑی شرم کی بات ہے ایک اجنبی لڑکی کو تنہا دیکھ کر آہیں بھرتے ہو۔"

نواز صاحب نے چونک کر عزت آراء کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ نواز صاحب کو خیال آ گیا کہ ابھی ابھی انہوں نے ریڈیو آن کیا تھا اور وہ سریلی آواز وہیں سے نشر ہو رہی تھی۔

مرد کا شوخ شوخ لہجہ سنائی دیا۔ "ہم اجنبی نہیں ہیں۔ اس چھوٹے سے سفر میں ہمارے درمیان ہمسفر کا رشتہ ہے۔"

عورت نے کہا۔ "سفر کے رشتے ہمیشہ ٹوٹنے کے لیے بنتے ہیں۔"

کار کی رفتار سست ہونے لگی۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ نواز صاحب تیز رفتاری بھول گئے۔ کار کی محدود فضا میں اس مرد کی آواز انہیں اپنی ہی آواز لگ رہی تھی۔

"تم دل توڑنے والی باتیں نہ کرو۔"

کاش کہ ایسا ہوتا

پیار کا میٹھا میٹھا سا

اک درد تجھے تڑپاتا

کوئی کنوارا سپنا

تیری نشیلی آنکھوں میں
پیار بھری انگڑائی لیتا
اور قوس قزح کی وہ انگڑائی
اڑتے بادل کو چھو لیتی۔

عزت آراء کی سوچوں میں انگڑائیاں بھر گئیں۔ اس کا سر کھڑکی کے شیشے سے ٹک گیا۔ گھنی پلکیں خوابوں کے بوجھ سے جھکنے لگیں۔ کوئی میٹھا میٹھا سا درد تھا جو گیت کی حرارت سے جاگ رہا تھا۔ کوئی کنوارا سپنا تھا جو آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دور دور تک کھلا روشن آسمان تھا اور اس کے انگڑائی لیتے ہوئے ہاتھ سفید بادلوں کو چھو رہے تھے۔

کبھی وہ بادلوں سے گزر رہی تھی۔ کبھی زمین کی ہریالی پر اِدھر اُدھر دیوانہ وار بھٹک رہی تھی۔ پھر کسی نے اس کے لہراتے ہوئے آنچل کو تھام لیا۔

"کون ہو تم؟"

اس نے پلٹ کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔

اس کا آنچل پھولوں کے ایک پودے سے الجھا ہوا تھا۔

وہ آنچل چھڑا کر پھر تتلی کی طرح اڑنے لگی۔

کھلی فضا میں کیسا نکھار تھا! ہواؤں میں کیسی تازگی تھی! انگ انگ میں تڑپنے، مچلنے، بھاگنے اور رہ رہ کر ہوا میں اڑ جانے کو جی چاہتا تھا مگر کسی نے پھر آنچل کو تھام لیا۔

"کون ہو تم؟"

اس نے پلٹ کر دیکھا تو دل دھڑکنے لگا۔

نواز صاحب اس کے دوپٹے کا سرا تھامے کھڑے تھے اور مسکراتے ہوئے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ہائے! وہ پتھر آخر پگھل ہی گیا۔ اس کا ہاتھ میرے آنچل تک پہنچ ہی گیا۔ کیسا مغرور تھا وہ۔ کبھی جھوٹے منہ بات بھی نہیں کرتا تھا۔ اب میری باری ہے۔ میں بھی بے رخی سے پیش آؤں گی۔

اس نے اپنے آنچل کو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا۔

"تم کون ہوتے ہو میرے آنچل کو ہاتھ لگانے والے؟"

"ایسی بے رخی سے پیش نہ آؤ عزت۔ میں برسوں سے تمہارے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ چپکے چپکے تم سے محبت کرتا رہا ہوں۔"

"اونہہ!" وہ شان بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ نواز صاحب ایک سائے کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک گہری کھائی کے کنارے پہنچ کر رک گئی۔

وہ اونچائی پر کھڑی تھی۔ اس کے سامنے اتنی گہری پستی تھی کہ اسے دیکھتے ہی گر پڑنے کا خوف محسوس ہونے لگتا تھا۔

اس نے کہا۔ "میں بلندی ہوں، تم پستی ہو۔ میرے خواب نہ دیکھو۔ اپنی حیثیت سے اونچا خواب دیکھنا حماقت ہے۔"

نواز صاحب نے کہا۔ "خواب ہمیشہ اپنی حیثیت سے اونچے دیکھے جاتے ہیں۔ آج سے نہیں، بچپن سے میں نے تمہیں خوابوں میں دیکھا ہے۔ نانی اماں اور دادی اماں نے پریوں کی کہانیاں سنا کر میرے ذہن میں تمہاری ایک تصویر بنائی تھی۔ میں نے بکاؤلی کے پھول میں تمہارا چہرہ دیکھا ہے جب بھی کسی کہانی کے دربار میں تمہارا سوئمبر رچایا گیا، میں تمہیں جیت کر لے گیا، میں نے تمہارے لئے سامری جادوگر کے طلسم کو خاک میں ملایا ہے۔ میں تمہارے خواب کیسے نہ دیکھتا؟ خواب مجھے دکھائے گئے ہیں۔ تمہارے لئے میرے دل میں ایک لگن، ایک تڑپ پیدا کی گئی ہے۔ آج خوابوں کی دہلیز پھلانگ کر تم میرے قریب آ گئی ہو۔ میں تمہاری تمنا کیسے نہ کروں؟ تمہیں میرے خوابوں کا واسطہ ہے، میری محبت کو نہ ٹھکراؤ۔"

عشق کی زبان جب حسن کی مدح سرائی کرتی ہے تو حسن ذرا اور مغرور ہو جاتا ہے۔

نواز صاحب التجائیں کر رہے تھے۔ محبت کی خیرات مانگ رہے تھے۔ حسن کو اس کی اہمیت کا احساس دلا رہے تھے۔

اور وہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک عورت ہے۔ مگر ایک ٹھوس مجسم ہستی نہیں ہے۔ تخیل کی دلکشی ہے۔ ایک شعر کا دھڑکتا ہوا مفہوم ہے۔ ایک مغنی کی سحر انگیز آواز ہے جسے نواز صاحب سن سکتے ہیں۔ مگر کسی آنچل کی طرح پکڑ نہیں سکتے۔

اس نے ایک انداز دلربائی سے نواز صاحب کو دیکھا پھر کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔ آگے گہری کھائی تھی۔ لیکن وہ گرنے کی بجائے فضا میں معلق رہی اور ہوا کے سینے پر قدم رکھتی ہوئی دوسری پہاڑی کی طرف جانے لگی۔

"رک جاؤ!" انہوں نے آواز دی۔ "مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"

"پیار کے راستے پر انسان خود بخود چلتا ہے' کسی کا سہارا تلاش نہیں کرتا۔" وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔

دوسری پہاڑی پر پہنچنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ جہاں سے وہ آئی تھی وہاں اب دور دور تک نواز صاحب کا پتہ نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کہاں چلے گئے تھے۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے تو محض انہیں ستانے اور تڑپانے کے لیے ساتھ چھوڑا تھا۔ ذرا دیر کے لیے ان سے دور ہو گئی تھی مگر وہ تو سچ مچ نظروں سے دور ہو گئے تھے۔

پھر اسے ایک مرد اور ایک عورت کا قہقہہ سنائی دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ نواز صاحب ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ پھولوں کی سیج پر بیٹھے ہوئے تھے اور بڑی بے تکلفی سے اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

وہ دوڑتی ہوئی ان کے قدموں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"نواز! میں تمہاری محبت ہوں۔ یہ کون لڑکی ہے؟ یہ تمہارے قریب کیوں آئی ہے؟"

"اب یہ میری محبت ہے۔" نواز صاحب نے کہا۔ "وہ زمانہ چلا گیا جب انسان محبت میں ناکام ہو کر محمل لیلیٰ کے پیچھے بھٹکتا تھا' یا پھر غم غلط کرنے کے لیے شراب کا سہارا لیتا تھا۔ وہ لوگ احمق تھے۔ اپنی آئندہ نسل کے دشمن تھے۔ وہ سماجی زندگی گزارنا نہیں جانتے تھے۔ مگر میں جانتا ہوں مجھے ایک ہنستے بستے گھر کی ضرورت ہے۔ اچھی اولاد کی ضرورت ہے۔ اس لئے میں نے اس خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی ہے۔"

"نہیں نہیں' تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہارے گھر کی جنت میرے دم سے آباد ہو گی۔"

"مجھے افسوس ہے۔ تم نے ایک سنہری موقعہ گنوا دیا۔ یاد رکھو ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی بہترین موقعہ آتا ہے۔ جو اس موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ وہ زندگی بھر آنسو

بہاتا رہتا ہے۔ تمہیں ماجدہ کا المیہ پسند تھا اس لئے ماجدہ کے آنسو تمہاری آنکھوں میں آ گئے۔ اب ساری زندگی روتی رہو۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

روشن کھلا ہوا آسمان نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چاروں طرف رات کی سیاہی پھیلتی چلی گئی۔ کوئٹہ کی برفانی ہوا کار کے شیشوں سے ٹکرا کر بین کر رہی تھی۔

اچانک عزت کو احساس ہوا کہ وہ ایک کار کی ملائم اور آرام دہ سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے اور وہ کار.... وہ کار ایک جگہ سڑک کے کنارے رکی ہوئی ہے۔

اس نے پریشان ہو کر نواز صاحب کی جانب دیکھا۔ وہ اسٹیئرنگ پر سر جھکائے خاموش بیٹھے ہوئے تھے جیسے بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو گئے ہوں۔

"آ.... آپ نے گاڑی کیوں روک دی؟"

"آں!" انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر پریشان ہو کر اپنے آس پاس کی اندھیری دنیا کو دیکھنے لگے۔

"کیا گاڑی خراب ہو گئی ہے؟" عزت نے پوچھا۔

"جی.... جی نہیں۔"

انہوں نے جلدی سے کار اسٹارٹ کی۔ گاڑی میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ پٹرول بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ صرف دماغ تھک کر تھوڑی دیر کے لیے خوابوں کے گیراج میں بند ہو گیا تھا۔

کار تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رینگنے لگی۔ ڈرامہ ختم ہو گیا تھا۔ اب ساز و آواز کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ عزت کھڑکی کی جانب منہ پھیر کر اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھنے لگی۔

نواز صاحب نے پوچھنا چاہا۔ "کیا آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے؟"

عزت آراء نے پوچھنا چاہا۔ "کیا آپ ڈرائیو کرنا بھول گئے تھے؟"

دونوں کے ذہن میں ابھرنے والے سوال ایسے تھے کہ دونوں پر ایک دوسرے کی کمزوری ظاہر ہو جاتی۔

کون اپنی کمزوری ظاہر کرنا پسند کرتا ہے؟ جہاں تک ہو سکے۔ اس پر پردہ ڈالنے کی ہی کوششیں کی جاتی ہیں۔

نواز صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "بالکل بکواس ڈرامہ تھا۔"

"جی.... جی ہاں.... بس یونہی سا تھا۔" عزت نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ اپنے ہمسفر کو ہم مزاج ہونے کا ثبوت دیا۔

نواز صاحب نے کہا۔ "اس ڈرامے کا صرف ایک مکالمہ اچھا تھا۔"

"کون سا؟"

"یہی کہ ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایک بہترین موقعہ آتا ہے۔ جو اس موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھاتا' وہ زندگی بھر آنسو بہاتا رہتا ہے۔"

عزت نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا۔ واقعی بہترین موقعہ کس طرح ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ابھی وہ ڈرامہ سنتے سنتے دل خون ہو رہا تھا۔

وہ ہولے سے بولی۔ "جی ہاں۔ وہ مکالمہ کسی حد تک ٹھیک ہی ہے۔"

"کسی حد تک کیا معنی؟" انہوں نے پوچھا۔ "کیا اس میں کوئی قباحت ہے؟"

"جی ہاں!" عزت نے جواب دیا۔ "بہترین موقعہ کو سمجھنا اور اسے پرکھنا بہت بڑی بات ہے۔ جو پرکھنا نہیں جانتے' وہ ایسے ویسے موقعہ کو بھی بہترین موقعہ سمجھ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔"

"آپ بڑے تجربے کی بات کہہ رہی ہیں۔ اگر میرا سوال گراں نہ گزرے تو جواب دیجئے۔ کیا آپ نے کبھی دھوکہ کھایا ہے؟"

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ دھوکہ کھانے کا ذاتی تجربہ ہو۔ دوسروں کی ٹھوکروں سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ نہیں تو کہانیاں اور ڈرامے بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ بائیں طرف موڑ لیجئے۔"

انہوں نے کار کو بائیں طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ آپ کی زندگی میں ابھی ایسا موقعہ نہیں آیا ہے جسے آپ "بہترین" کہہ سکیں؟"

وہ خاموش رہی۔ فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ نواز صاحب کے اس سوال سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی نجی زندگی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

وہ ذرا توقف کے بعد آہستگی سے بولی۔ "نہیں! آگے بھی بائیں طرف ٹرننگ ہے۔"

"آپ بائیں طرف بیٹھی ہیں۔ جتنی ٹرننگیں ہیں' وہ بھی بائیں طرف آتی ہیں۔ کیا آپ کا مکان بھی بائیں طرف ہے؟"

"جی ہاں! وہ دیکھئے سبز رنگ کا مکان ہے۔ سامنے لکڑی کا گیٹ ہے۔"

انہوں نے مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ پھر وہ کار سے نکل کر دوسری طرف گھومتے ہوئے عزت کے قریب آئے اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

"شکریہ!" وہ کار سے باہر آ گئی۔

دونوں چند ساعت تک ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ شاید کچھ کہنے کے لئے الفاظ تلاش کر رہے تھے۔ پھر نواز صاحب دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف جانے لگے۔

"سنئے!" عزت نے آہستگی سے پکارا۔

ان کے قدم رک گئے۔ وہ دو قدم آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ "آپ نے مجھے یہاں تک پہنچانے کی زحمت اٹھائی ہے۔ بقول آپ کے آپ نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ میں بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ میرے ہاں ایک پیالی چائے پینا پسند کریں گے؟"

انہوں نے کار کے اس پار سے اس پار عزت کی طرف دیکھا۔ نیم تاریکی' تنہائی' دعوت' چائے کی کھنکتی ہوئی پیالی' عزت کا مترنم لہجہ۔ ایسے موقعہ پر کچھ آگے بڑھنے سے بات بھی آگے بڑھتی ہے۔ کیا بہترین موقعہ اسی کو کہتے ہیں؟

انہوں نے مجبوری کا اظہار کیا۔

"آپ جانتی ہیں کہ میں چائے وقت پر پیتا ہوں۔ اس وقت ساڑھے گیارہ ہو گئے ہیں۔ اگر میں نے چائے پی لی تو پھر نیند نہیں آئے گی۔ کبھی دن کے وقت یہاں سے گزر ہوا تو آپ کو تکلیف ضرور دوں گا۔"

وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ دروازہ بند کر کے انہوں نے کار اسٹارٹ کی اور اسے یوٹرن دیتے ہوئے واپس چلے گئے۔

اسی وقت پڑوس کے مکان سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "موٹر کی آواز ہے' نہ جانے کون آیا ہے۔"

جواب میں کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ "آیا نہیں' آئی ہے۔ وہی نام کی عزت آراء ہے۔ اب پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ پھر وہی بڑی بڑی کاروں والے یہاں آنے لگے ہیں۔"

عزت نے گھور کر پڑوسی کے مکان کی طرف دیکھا۔

اندھیرے میں وہ مکان بدنامی کی سیاہی کی طرح اس کے وجود پر حاوی ہوتا نظر آیا۔ وہ جلدی سے قدم بڑھاتی ہوئی اپنے مکان میں داخل ہو گئی۔

☆============☆============☆

شبنم کی حقیقت یہی ہے کہ وہ رات کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو ہے۔ یہ آنسو گھاس پر بکھرے تو قدموں تلے روند دیا جاتا ہے اور پھول کی پنکھڑی پر ٹپکے تو چوم لیا جاتا ہے۔

ساری رات شبنم کی ایک ایک بوند' کلی کی چھاتی پر دھڑکتی ہے۔ تب کہیں پیار کا ایک پھول کھلتا ہے۔

شبنم بھی فرہاد کے سینہ میں پیار کی ایک ایک بوند ٹپکاتی رہی۔ بہت آہستہ آہستہ۔ بڑی خاموشی سے چپکے چپکے اپنی باتوں سے اپنی نیک خصلتوں سے اور اپنی میٹھی میٹھی اداؤں سے فرہاد کے دل میں اپنے لئے جگہ بناتی رہی۔

فرہاد بظاہر پتھر تھا مگر اس کا دل پتھر نہیں تھا۔ کچھ بھی ہو ایک مصنفہ کا بھائی تھا۔ نازک جذبات و احساسات کو اچھی طرح سمجھتا تھا' لیکن ہمیشہ محتاط رہنے کا عادی تھا۔ خود کو اور اپنی بہن کو بدنامی سے بچانے کے لیے وہ بہت ہی محتاط ہو کر شبنم سے ملتا تھا۔

وہ صبح شبنم کی کوٹھی میں آتا تھا اور شام تک کاروبار کے سلسلہ میں اس کے ساتھ مصروف رہتا تھا۔ پہلے پہل یہ بات اس کے مزاج پر گراں گزری کہ وہ مرد ہو کر ایک عورت کی دولت سے کاروبار کرے اور اس کا احسان اٹھائے۔

اس نے اشارتاً شبنم سے بھی کہا۔

شبنم نے جواب دیا۔ "آپ اس مسئلہ کے ایک ہی پہلو پر غور کر رہے ہیں۔ آپ یہ سوچیں کہ میں آپ کے لئے ایک بہت بڑی رقم خرچ کرکے احسان کر رہی ہوں۔ اگرچہ احسان ہے تو اس سے بڑا احسان آپ مجھ پر کریں گے' کاروبار میں میری خرچ کی ہوئی رقم کی حفاظت کریں گے۔ اسے دیانتداری سے استعمال کریں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں' بلکہ میری اس رقم کو منافع کے ساتھ واپس کریں گے۔

"آپ خود ہی سوچئے کہ مجھ پر آپ کا کتنا بڑا احسان ہوگا۔ جو رقم یونہی بینک میں پڑی رہتی۔ اسے آپ اپنی محنت سے بڑھائیں گے۔ اصل چیز محنت ہے۔ اگر آپ محنت نہیں کریں تو میں بیٹھے بیٹھے اپنی ساری پونجی کھا جاؤں گی۔"

فرہاد نے کہا۔ "تم بھی کاروبار کے ایک پہلو پر غور کر رہی ہو۔ تمہیں یہ بھی سوچنا

چاہئے کہ میں کاروبار کے معاملہ میں ناتجربہ کار ہوں۔ میری وجہ سے تمہاری رقم ضائع بھی ہو سکتی ہے۔"

"آپ کی وجہ سے کیوں؟ کیا آپ جان بوجھ کر نقصان پہنچائیں گے؟"

"نہیں' میں تمہیں نقصان پہنچانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"پھر تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تقدیر میں اگر نقصان اٹھانا لکھا ہے تو ہم نقصان اٹھائیں گے ورنہ ہماری دیانتداری اور جدوجہد میں کمی نہیں آئے گی۔"

فرہاد کے دل سے میل نکل گیا۔ اب غیرت کا سوال نہیں تھا بلکہ دیانتداری کی آزمائش تھی کہ وہ کتنی ایمانداری سے' کتنی سوجھ بوجھ اور کتنی جدوجہد سے کاروبار میں لگائی ہوئی رقم کی حفاظت کر سکتا ہے اور شبنم کو اس رقم کا منافع دے سکتا ہے۔

دوسری شام کو وہ شبنم کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کسی کرنل صاحب کی کوٹھی کی طرف گیا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ "اتنے بڑے فوجی افسر سے تمہاری واقفیت کیسے ہو گئی؟"

شبنم فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ خاموشی سے کار ڈرائیو کرتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "کرنل صاحب کے ایک بھانجے ہیں۔ جو کبھی مجھ سے دیوانوں کی طرف عشق کیا کرتے تھے۔"

فرہاد کو یہ بات گراں گزری۔ اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "اب تک تم نے کتنے عشق کئے ہیں؟"

وہ خاموش رہی۔ شاید اپنے محبوب کی باتوں کے زہر کو پی رہی تھی۔ فرہاد نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم مجھے ایسی جگہ لے جا رہی ہو جہاں میں ندامت سے سر نہ اٹھا سکوں۔ بہتر ہے کہ گاڑی یہیں روک دو۔"

شبنم نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اس سے پہلے کہ آپ کا سر ندامت سے جھکے میں اپنی جان دے دوں گی۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر بھروسہ کر لیجئے۔ میں جہاں جا رہی ہوں' میرے ساتھ چلئے۔ اگر آپ کو میرا کوئی گھناؤنا روپ نظر آئے تو مجھ پر تھوک کر چلے آیئے گا۔"

فرہاد خاموش ہو گیا۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ چلو زندگی میں یہ تجربہ بھی سہی' ایک بدنام عورت کے ساتھ رہ کر یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ وہ اپنی بدنامی کے داغ کو کس طرح دھوتی ہے۔

کرنل صاحب کی کوٹھی میں پہنچ کر اس نے اپنی آمد کی اطلاع بھجوائی۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر مسلح فوجی جوان پہرہ دے رہے تھے۔ ایروں غیروں کو وہاں قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن شبنم کی اطلاع پہنچتے ہی اسے اور فرہاد کو اندر بلا لیا گیا۔

یہ بہت اونچی بات تھی کہ اتنی اونچی جگہ شبنم کی پہنچ تھی۔ لیکن فرہاد متاثر نہ ہوا۔ اس نے دل میں سوچا کہ بہت سے فوجی افسر عیاش ہوتے ہیں۔ اس لئے شبنم جیسی جوان اور حسین عورتیں آسانی سے وہاں تک رسائی حاصل کر لیتی ہیں۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ کرنل صاحب ایک معمر اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے آتے ہی بڑی محبت سے شبنم کو مخاطب کیا۔ "ہیلو گڑیا! آج کیسے آگئیں؟"

شبنم نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کی نصیحتوں پر عمل کرنے آئی ہوں۔ یہ مسٹر فرہاد انور ہیں۔ آپ کی نصیحتوں پر عمل کرنے سے پہلے میں ان کا اعتماد حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

کرنل صاحب نے فرہاد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیے۔"

پھر انہوں نے شبنم سے پوچھا۔ کیا تم نے فرہاد صاحب کو کچھ نہیں بتایا ہے؟"

شبنم نے جواب دیا۔ "صرف اتنا بتایا ہے کہ میں ان کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتی ہوں۔"

انہوں نے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "فرہاد صاحب! شبنم کی حقیقت یہی ہے کہ وہ رات کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو ہے۔ یہ آنسو گھاس پر بکھرے تو قدموں تلے روند دیا جاتا ہے اور پھول کی پنکھڑیوں پر ٹپکے تو چوم لیا جاتا ہے۔

"یہ شبنم جو آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ اس کا ماضی بہت تاریک ہے۔ اتنا تاریک جیسے کالی رات ہوتی ہے۔ یہ اسی رات کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو ہے۔ ہماری دانش مندی یہی ہے کہ ہم اس کے ماضی کو کریدنے کی بجائے آنسو کے اس صاف و شفاف قطرے کی قدر کریں۔

"یہ اب سے چار ماہ پہلے کی بات ہے کہ ایک روز شبنم میرے پاس آئی اور اس نے

مجھے بتایا کہ میرے ایک بھانجے صاحب اس سے عشق کرنے لگے ہیں۔ اس نے اپنے متعلق بھی جھوٹ نہیں کہا۔ صاف صاف بتا دیا کہ یہ ایک بھٹکی ہوئی عورت ہے لیکن اب اس نے توبہ کر لی ہے اور شریف عورتوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنے دروازے پر آنے والوں سے ہمیشہ کے لیے ناطہ توڑ دیا ہے۔

"میرے بھانجے کو بھی اس نے صاف صاف جواب دے دیا تھا لیکن وہ زبردستی پر اتر آیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ شبنم اس کے لیے کھلونا بنی رہے۔

"اس کی داستان سن کر میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ یہ ہمارے لئے کتنے شرم کی بات ہے کہ ایک بھٹکی ہوئی عورت راہ راست پر آنا چاہتی ہے اور ہمارے شریف خاندان کے نوجوان اسے شریفانہ زندگی گزارنے کا موقعہ نہیں دیتے۔

"میں ایک بہت بڑا فوجی افسر ہوں۔ میں اپنے بھانجے کی برائیوں پر پردہ ڈال سکتا تھا اور شبنم کو ایک بدکار عورت کہہ کر اسے یہاں سے دھکے دے کر نکلوا سکتا تھا۔ کوئی میرا کیا بگاڑ لیتا۔ میں جو بھی کرتا' لوگ اسے درست ہی سمجھتے کیونکہ بڑے لوگ اور اعلیٰ افسران جو کچھ کرتے ہیں' وہی اس معاشرے کا قانون بن جاتا ہے۔

"لیکن میں قانون کا چہرہ نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔ میں نے شبنم کے سامنے اپنے بھانجے کو بلا کر اسے سخت سزائیں دیں۔ اس نے توبہ کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی شبنم کو پریشان نہ کرے گا۔

"لیکن کسی ایک شخص کو سزا دینے سے شبنم محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ ایک عورت ہے۔ بہت سے خودغرض لوگ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسے پھر گھناؤنی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ تنہا ایک شریف عورت کی طرح زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس جیسی عورت کو ایک مضبوط اور بلند حوصلہ مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اسے مرد کی پناہ میں دیکھ کر پھر کوئی اس کے قریب آنے کی جرات نہیں کرے گا۔

دو ماہ کے بعد یہ پھر میرے پاس آئی۔ اس نے کہا کہ یہ کسی کی عزت بن کر نہیں رہ سکتی کیونکہ سب اسے گناہگار کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور یہ بھی کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی کیونکہ پہلی ملاقات میں لوگ اپنی محبت کا یقین دلاتے ہیں' اس سے ہمدردی ظاہر

کرتے ہیں لیکن جب شادی کا سوال آتا ہے تو نظریں چرا کر چلے جاتے ہیں۔

"اس معاشرے میں ایک بار عورت پر داغ لگ جاتا ہے تو لوگ اسے مٹانے کی بجائے بڑھانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑ کر ثابت و سالم بنا لیتے ہیں مگر ٹوٹی ہوئی عورت پر یقین نہیں رکھتے کہ وہ صحیح معنوں میں پارسا بن سکتی ہے۔

"عورت کے لیے مثال دی جاتی ہے کہ وہ ایک شیشہ ہے ٹوٹ جائے تو جوڑا نہیں جا سکتا۔ جوڑ دیا جائے تو اس میں بال آ جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ عورت کے لیے شیشہ کی مثال کیوں دی جاتی ہے۔ مرد کے لیے بھی یہ مثال کیوں نہیں دی جاتی۔ دونوں ہی انسان ہیں۔ دونوں کا کیریکٹر ہوتا ہے پھر مرد برائی کر کے شیشہ کی طرح کیوں نہیں ٹوٹتا؟ بہت سے مرد ہیں جو برائی سے توبہ کر کے نیکی کی زندگی گزارتے ہیں۔ پھر عورت کی توبہ کیوں نہیں قبول ہوتی؟ کیوں اس کے ماضی کو کرید کر اسے بدنام کیا جاتا ہے؟

"نہیں! نہ مرد شیشہ ہے نہ عورت شیشہ ہے۔ اس دنیا کی غلاظتوں سے گزر کر اور اس زندگی کی آگ میں جل کر جو کندن بن جائے' وہی سچا انسان ہوتا ہے۔ اتنے تجربات کے بعد پھر گناہ اسے نہیں بہکاتا۔

"ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مرد اور بعض عورتیں توبہ کے بعد بھی بہک جاتی ہیں۔ لیکن سب نہیں بہکتے۔ شبنم آزمائشی دور سے گزر رہی ہے۔ یہ توبہ کے بعد بھی بہکے گی یا نہیں' ہم اس کی سچائی کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے' جب تک کہ اسے آزمانے کی کوشش نہ کریں۔

"لیکن افسوس کہ کسی نے آزمانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ مایوس ہو کر میرے پاس آئی اور مجھ سے کہا کہ اس نے شادی کا خیال ترک کر دیا ہے۔ اب اس نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ کسی لائف پارٹنر کا سہارا لینے کی بجائے کسی ایماندار بزنس پارٹنر کا سہارا لے گی۔ بزنس کے سلسلہ میں بھی ایک مرد ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔ وہ بیوہ سمجھ کر نہیں تو کم از کم بزنس پارٹنر ہی سمجھ کر اس کی حفاظت کرتا رہے گا۔

"میں نے اس کے فیصلہ کی تائید کی۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد یہ کسی مرد کی پناہ میں آ جائے۔ میں نے اسے کہا کہ ٹھیک ہے۔ یہ کسی ایماندار شخص کا انتخاب کرے اور میرے پاس آئے۔ میں کاروبار کے سلسلہ میں اس کی مدد کروں گا۔

"اور مسٹر فرہاد! شبنم نے جس انداز میں آپ کا تعارف کرایا ہے اس سے میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ آپ کو اپنا بزنس پارٹنر بنانا چاہتی ہے لیکن آپ شاید اس پر پوری طرح اعتماد نہیں کرتے ہیں۔"

فرہاد صوفہ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "جی ہاں' پہلے اعتماد نہیں تھا۔ ہم انسان کے ماضی کو دیکھ کر اس کی موجودہ زندگی کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ آپ کی گفتگو کی روشنی میں آج میں نے یہ سیکھا ہے کہ انسان محض اپنے ماضی سے ہی نہیں' اپنی توبہ سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ ایک توبہ سے اس کی زندگی کا سارا نقشہ ہی بدل سکتا ہے بشرطیکہ ہم اسے راہ راست پر چلنے کا موقعہ دے کر آزمانے کی کوشش کریں۔

"آپ مجھ سے زیادہ تجربہ کار اور زمانہ شناس ہیں۔ آپ کی باتیں دل کو لگتی ہیں۔ شبنم کی طرح میں بھی آپ کی نصیحتوں پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو کہیں گے میں اس پر پوری طرح عمل کروں گا۔"

کرنل صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ ذہین بھی ہیں اور سعادت مند بھی۔ میں شبنم کے انتخاب پر بہت خوش ہوں۔ فی الحال آپ سے یہی چاہتا ہوں کہ آپ شبنم پر اعتماد کریں۔ اگر اس سے کبھی کوئی شکایت پیدا ہو جائے' یا اس کے متعلق آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں تو آپ مجھ سے ملاقات کریں کیونکہ تم دونوں جوان ہو۔ تم دونوں جذباتی انداز میں غلط فیصلے کر سکتے ہو۔ لیکن میرا بڑھاپا سوچنے سمجھنے کا عادی ہے۔ میں تم لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمی کی وجوہات کو سمجھ لوں گا اور انہی کے مطابق فیصلہ کروں گا۔"

فرہاد نے سر جھکا کر کہا۔ "جی بہت اچھا۔ میں آپ کے مشوروں پر عمل کروں گا۔"

"ویری گڈ! اب کل سے اپنے کاروبار پر توجہ دیجئے۔ آپ ایک بکس ایجنٹ کی حیثیت سے باقاعدہ لیٹر پیڈ وغیرہ چھپوایئے اور میرے پاس آیئے۔ میں آپ کو ملٹری لائبریری میں کتابیں اور رسالے سپلائی کرنے کے لیے آرڈر دوں گا۔ اگر آپ نے یہ کام بخوبی انجام دیا تو آئندہ آپ کو اسپورٹس گڈز سپلائی کرنے کا مستقل ٹھیکہ مل جائے گا۔"

اسی وقت چائے آ گئی۔ شبنم نے چائے بناتے ہوئے کہا۔ "انکل! میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ اگر آپ نہ ہوتے تو میں ساری زندگی بھٹکتی ہی رہ جاتی۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "جب تم مجھے انکل کہتی ہو تو پھر احسان کس بات کا۔ کیا بزرگ اپنے بچوں پر احسان کرتے ہیں؟ نہیں' احسان نہیں کرتے بلکہ بچوں کی زندگی سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

فرہاد نے کہا۔ "میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ضرور..... کہئے؟"

"آپ مجھے آپ نہ کہیں' تم سے مخاطب کریں۔ میں بھی آپ کا بچہ ہوں۔"

کرنل صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ چلو تم بھی میرے بچوں کی فہرست میں شامل ہو گئے ہو۔"

شبنم مسکرا کر چور نظروں سے فرہاد کو دیکھتی رہی۔ کرنل صاحب کی شخصیت سے متاثر ہو کر فرہاد اس پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ آج اسے کتنی بڑی خوشی نصیب ہوئی تھی۔ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی بیٹھے بیٹھے آزاد پنچھی کی طرح کھلی فضاؤں میں اڑنے لگے اور دل کی گہرائیوں سے قہقہے لگانے لگے۔

چائے پینے کے بعد وہ کرنل صاحب سے رخصت ہو کر باہر آئے۔

باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ پورچ کے آس پاس گملوں میں پھول مہک رہے تھے۔ فرہاد کے شانہ بشانہ چلتی ہوئی شبنم بھی ایک پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ کرنل صاحب کی کوٹھی سے نکلتے وقت فرہاد کو احساس ہوا کہ شبنم واقعی ایک پھول ہے جسے طوفانی ہواؤں سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری اس نے کرنل صاحب کے سامنے قبول کی ہے۔

اس نے پہلی بار چور نظروں سے شبنم کو دیکھا۔ یوں تو تمام دن ہی دیکھتا رہا تھا لیکن اب اس کے دیکھنے کے انداز میں نیا پن آ گیا تھا۔

جب نگاہیں نئی نویلی ہو جائیں تو جلوہ بھی نئی حشر سامانیوں کے ساتھ دل میں اتر جاتا ہے۔

شبنم کے اُجلے شفاف چہرے پر سو کینڈل پاور کی روشنی اس طرح جھلملا رہی تھی جیسے شبنم کے قطرے پر سورج کی پہلی کرن اتر رہی ہو۔

اس کے صحت مند جسم پر ململ کی ساڑھی ایسے چپکی ہوئی تھی' جیسے لوہا' مقناطیس

سے چپک کر رہ جاتا ہے۔ ململ کے پیچھے سے اس کے پیٹ کی چکنی سطح اور بلاؤز کا مغرور ابھار ایسے جھلک رہا تھا جیسے شراب شیشہ کے ساغر سے اشارے کے انداز میں جھلکتی ہے۔

فرہاد کو ذرا سی دیر میں کتنی ہی حسین اور رنگین مثالیں یاد آ گئیں۔

زندگی میں پہلی بار کسی عورت کے متعلق اس نے اتنی مثالیں یاد کیں۔ دل کا میل اتر جائے' ذہن کی گرہیں کھل جائیں' رات آ جائے' چاند طلوع ہو جائے اور چاندنی مجسم ہو کر شبنم کا حسین سراپا اختیار کر لے تو شاعری الہام کی طرح دل پر دستک دیتی ہے۔

لیکن وہ شاعری کو زبان پر نہ لا سکا۔

ابھی ابتدا تھی۔

دل کی دھڑکنوں کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لینا گوارا نہیں تھا۔

ابھی تو آزمائشی دور شروع ہوا تھا۔

دیکھنا یہ تھا کہ شبنم راستی کے سفر میں کہاں تک ثابت قدم رہتی ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ وہ شبنم کی تمام بدنامیوں کے باوجود اس سفر میں کہاں تک اس کا ساتھ دے سکتا ہے۔

ایک عورت کی ذمہ داری کم تھی۔ اسے صرف اپنے نیک ارادوں پر اٹل رہنا تھا۔

ایک مرد کی ذمہ داریاں زیادہ تھیں کیونکہ اسے ایک عورت کے ماضی پر ہمیشہ کے لیے پردہ ڈالنا تھا اور آئندہ اسے دوسروں کی غلیظ نگاہوں سے بچ کر رہنے میں اس کی مدد کرنا اور ہر حال میں اس کی حفاظت کرنا تھا۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کار کے قریب آ گئے۔

شبنم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔ اس کا ایک ہاتھ دروازے پر تھا' اس سے پہلے کہ وہ اپنی سیٹ کی جانب بڑھتی۔ فرہاد نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اچانک شبنم کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ان کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھو رہے تھے اور سب سے حسین بات یہ تھی کہ فرہاد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ فرط مسرت سے شبنم کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ پلکیں حیا سے جھکنے لگیں۔

فرہاد نے آہستگی سے کہا۔ "میں کار ڈرائیو کروں گا۔ تم اس طرف بیٹھو۔"

"آپ.... آپ ڈرائیو کرنا جانتے ہیں؟"

"ہاں۔ بیروزگاری کے زمانہ میں میرے ایک ٹیکسی ڈرائیور دوست نے سکھادیا تھا کہ بھوکے مرنے کی نوبت نہ آئے۔ اگر روزگار کا یہ ذریعہ نہ ملتا تو میں بھی ٹیکسی ڈرائیور بن جاتا۔"

اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر سے ہٹالیا۔ وہ مسکراتی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

وہ کار اسٹارٹ کر کے مین گیٹ سے باہر آیا تو شبنم نے پوچھا۔ "یہاں آتے وقت آپ نے ڈرائیو کیوں نہیں کیا؟"

اس نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت مجھے یقین نہیں تھا کہ ہم دونوں واقعی ایک ہی راستے کے مسافر بن سکیں گے۔ میں نے کرنل صاحب سے وعدہ کیا ہے کہ میں تم پر اعتماد کروں گا اور میں اعتماد کر رہا ہوں۔ اب تم میری موجودگی میں وہ کام نہ کرنا جو ایک مرد کو کرنا چاہئے۔ اسی لئے میں ڈرائیو کر رہا ہوں۔"

شبنم نے بڑی مسرت اور بڑی احسان مندی سے اس کی جانب دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک مرد نے اس کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں اُسے رونا نہیں چاہئے تھا مگر یہ آنسو موقع محل نہیں دیکھتے۔ خوشی کے موقعوں پر بھی چھلک پڑتے ہیں۔

☆============☆============☆

انسان کو جس طرح صدمہ مارتا ہے اس طرح کوئی بیماری نہیں مارتی سب سے گہری چوٹ دل پر لگتی ہے جسم پر نہیں اس کا بدن بخار سے نہیں نفرت سے جل رہا تھا۔

شبنم کی دنیا ہی بدل گئی۔

فرہاد اس کا جیون ساتھی نہیں تھا لیکن تمام دن ایسے ساتھ رہتا تھا جیسے جنم جنم کا ساتھ ہو۔

ساتھ ہونے کے باوجود دونوں کے درمیان تکلفات کی دیوار تھی۔ ایک انجانا سا فاصلہ تھا۔ کاروباری دوستی تھی لیکن بے تکلفی نہیں تھی۔ محبت کی ڈھکی چھپی کمزوریاں تھیں لیکن محبت کا کھلا اظہار نہیں تھا۔ وہ دونوں حقیقی زندگی کے قریب آ کر بناوٹی زندگی گزار رہے تھے۔

شبنم کی یہی جستجو تھی کہ فرہاد کو کون سی چیز پسند ہے اور کون سی ناپسند ہے۔ وہ رفتہ رفتہ اس کی پسند کے مطابق ڈھلتی جا رہی تھی۔ اب اس نے بے پردگی چھوڑ دی تھی اور برقعہ پہن کر فرہاد کے ساتھ باہر نکلتی تھی حالانکہ فرہاد نے اسے برقعہ پہننے کے لیے نہیں کہا تھا لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ پرانے جاننے والوں میں سے کوئی اسے پہچان کر گفتگو کرے اور یہ بات فرہاد کو ناگوار گزرے۔

اسے باہر کی دنیا سے اب کچھ نہیں لینا تھا۔ بس ایک فرہاد تھا۔ جس کے سامنے وہ اپنے حسن و جمال کی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہونا چاہتی تھی اور کوئی تمنا اس کے دل میں نہیں تھی۔ اس لئے اس نے خود کو برقعہ کی چاردیواری میں چھپا لیا تھا۔ کاروبار کے سلسلہ میں اگر کوئی ملنے آتا تو وہ کسی کے سامنے نہیں جاتی تھی۔ فرہاد ہی سب سے نمٹ لیا کرتا تھا۔

دن بڑے اعتماد سے گزر رہے تھے۔

فرہاد آرڈرز کے مطابق ملٹری لائبریری میں کتابیں سپلائی کر رہا تھا۔ دو ماہ کے دوران اس نے چالیس ہزار روپے کی کتابیں اور رسالے سپلائی کئے اور پندرہ ہزار کا منافع حاصل کیا۔ یہ کاروبار ایسا تھا کہ نقصان کا خدشہ ہی نہیں تھا۔ کرنل صاحب کی وجہ سے دوسرے

افسران سے بھی اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ فوری طور پر بلوں کی ادائیگی ہو جاتی تھی۔ تیسرے مہینے اسپورٹس گڈز سپلائی کرنے کا آرڈر بھی مل گیا۔

رفتہ رفتہ ایک کنٹریکٹر کی حیثیت سے اس کی ساکھ قائم ہو رہی تھی۔ بزنس پارٹنر کی حیثیت سے منافع میں دونوں کا برابر حصہ تھا۔ اس لئے فرہاد کے دن پھر گئے تھے۔ عمدہ لباس میں اس کی شخصیت اور زیادہ نکھر گئی تھی۔ اس نے عزت آراء سے کئی بار کہا کہ اب اسے ملازمت نہیں کرنا چاہئے لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ جہاں عزت ہو' پیسہ ہو اور کسی سے کوئی شکایت نہ ہو تو پھر لگی ہوئی روزی کو ٹھکرانے سے کیا فائدہ؟ یہ تو سراسر نادانی ہے۔ بہن کی ضد دیکھ کر فرہاد خاموش ہو گیا۔

ویسے ماں اور بہن دونوں ہی شبنم سے ملنے کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔ فرہاد کو شبنم سے اب کوئی شکایت نہیں تھی لیکن وہ اس حد تک بے تکلف نہیں ہونا چاہتا تھا کہ اپنے گھر والوں سے بھی اس کے تعلقات پیدا ہو جائیں۔ نہ جانے اس کے دل میں کیسی کھٹک تھی یا پھر وہ اب تک فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ زندگی کے اس سفر میں شبنم کے ساتھ کتنی دور تک جا سکے گا۔

اس نے کاروباری مصروفیات کا بہانہ کر کے ماں اور بہن کو ٹال دیا کہ پھر کسی دن شبنم سے ملاقات کراؤں گا۔

ایک صبح وہ شبنم کی کوٹھی میں پہنچا تو پورچ میں کسی کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ کوئی شخص برآمدے میں کھڑا ہوا ملازمہ سے باتیں کر رہا تھا۔

ملازمہ نے فرہاد کو دیکھتے ہی کہا۔ "صاحب جی! بی بی جی ان سے ملنا نہیں چاہتی ہیں لیکن یہ زبردستی کوٹھی کے اندر آنا چاہتے ہیں۔"

فرہاد نے اجنبی سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں جناب؟"

"میرا نام برکت علی ہے۔ یہ کوٹھی میری ہے۔ میں جب چاہوں' یہاں آ سکتا ہوں۔"

"بے شک۔ یہ کوٹھی اگر آپ کی ہے تو آپ جب چاہیں یہاں آ سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا یقین دلا دیجئے کہ واقعی یہ آپ کی کوٹھی ہے۔"

"میں آپ کو کیوں یقین دلاؤں۔ آپ کون ہیں؟"

"فی الحال مجھے یہاں کا چوکیدار سمجھ لیجئے۔ جب تک آپ اس کے مالک ہونے کا ثبوت پیش نہیں کریں گے' اندر نہیں جاسکیں گے۔"

برکت نے ہنستے ہوئے کہا۔ "چوکیدار صاحب! اپنی مالکن سے جا کر پوچھئے تو بتائے گی' کہ میں نے یہ کوٹھی اسے خرید کر دی تھی۔ کیوں خرید کر دی تھی۔ یہ بتانا ضروری نہیں ہے تم کافی سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔"

آخری بات اس نے معنی خیز انداز میں ایک آنکھ دبا کر کہی۔ اس کے آنکھ مارنے سے فرہاد کو یوں محسوس ہوا جیسے شبنم ساری دنیا کے سامنے ننگی ہو گئی ہے۔ اس کے دل میں ایک چوٹ سی لگی۔ اس نے غصہ سے کہا۔ "ہاں! ایسی کوئی بات نہ بتاؤ جو تہذیب کے خلاف ہو کیونکہ ایسی باتوں سے صرف ایک شبنم ہی نہیں' تمہارے جیسے کتنے ہی شریف زادوں کے چہروں کی سیاہی سامنے آجاتی ہے۔ کسی عورت پر کیچڑ اچھالنے کی بجائے اپنے دل و دماغ کی گندگی کو صاف کرو تو بہتر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کوٹھی شبنم کے نام پر ہے اور اس کے کاغذات بھی اسی کے پاس ہیں۔ لہٰذا چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ اور پھر کبھی یہاں کا رخ نہ کرنا۔"

برکت نے غصہ سے کہا۔ "تم مجھ پر دھونس جما رہے ہو۔ جانتے ہو میں کون ہوں۔ میں چاہوں تو تمہیں۔۔۔۔"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فرہاد نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ برآمدے سے لڑکھڑاتا ہوا اپنی کار کے قریب جا کر گرا۔

وہ بوکھلا کر بڑبڑانے لگا۔ "ارے۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔ ایک شریف آدمی پر ہاتھ اٹھاتے ہو' مار پیٹ کرتے ہو' زبان سے بات نہیں کرتے۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے۔"

فرہاد نے ایک ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑا۔ دوسرے ہاتھ سے کار کا دروازہ کھولا اور اسے ڈرائیونگ سیٹ پر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"اس وقت ایک ہی ہاتھ پر بس کر رہا ہوں۔ آئندہ کبھی کوٹھی کے آس پاس دکھائی دو گے تو اپنے پیروں سے چل کر ہسپتال نہیں جاسکو گے۔ چلو جاؤ یہاں سے۔"

اس نے جلدی سے کار اسٹارٹ کی اور پھرتی سے ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے احاطہ سے باہر چلا گیا۔

فرہاد اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کہ وہ کار نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ وہ اندر ہی اندر غصہ سے تلملا رہا تھا۔ اسے شبنم پر بھی غصہ آرہا تھا۔ جس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے۔

وہ غصہ سے طنطناتا ہوا کوٹھی کے اندر آیا۔ ڈرائنگ روم میں شبنم اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر اس کمرے کی طرف جانے لگا جہاں ضروری فائلیں رکھی رہتی تھیں۔ وہ کمرہ دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

شبنم اس کے پیچھے چلتی ہوئی بولی۔ "آپ۔۔۔۔ کیا آپ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں؟"

"میری ناراضگی سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہئے۔ ہم محض بزنس پارٹنر ہیں۔ کار کی چابی لاؤ۔"

وہ کمرے کے اندر آگیا اور فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ شبنم نے عاجزی سے کہا۔ "میں چابی دیتی ہوں۔ آپ پہلے چائے پی لیجئے۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔" اس نے ایک فائل اٹھا کر کہا۔ "چابی لاؤ۔"

اس نے چابی دیتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لیے مجھ سے ناراض ہو کر مت جایئے۔"

وہ ہاتھ سے چابی چھین کر بولا۔ "میرا بس چلے تو میں اس کوٹھی میں کبھی قدم نہ رکھوں۔ ایک طرف تم پارسائی کا ڈھونگ رچاتی ہو اور دوسری طرف ایک ذلیل آدمی کی خیرات کی ہوئی کوٹھی میں رہتی ہو۔"

"اسے خیرات کی چیز مت سمجھئے۔ اس کے لیے میرے جسم کا خون نچوڑا گیا ہے۔ پچھلی زندگی کی ٹھوکروں میں مجھے جو کچھ ملا اس سے انکار نہیں کیا اور جو کچھ لٹ گیا اس کے لیے فریاد نہیں کی۔ ایک پناہ گاہ حاصل کرنے کے بعد میں عزت سے رہنا چاہتی ہوں۔ تو آپ ناراض ہو جاتے ہیں۔"

"ایسی جگہ تم کبھی عزت سے نہیں رہ سکتیں۔ اس کوٹھی پر تمہاری پچھلی زندگی کی سیاہی لگی ہوئی ہے۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ شبنم دوڑتی ہوئی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "صرف اس کوٹھی پر میری پچھلی زندگی کی سیاہی نہیں ہے۔ میرا یہ جسم دیکھ رہے ہیں۔ یہ جسم بھی داغدار ہے۔ میں آپ کے حکم

سے کوٹھی سے نکل کر جا سکتی ہوں مگر اس جسم سے باہر نکل کر کیسے جاؤں۔ کیا مر جاؤں؟"

"ہاں مر جاؤ۔ مگر میرا وقت ضائع نہ کرو۔"

وہ اسے ایک طرف دھکا دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ شبنم صوفہ کے قریب جا کر گر پڑی تھی۔ جب تک وہ دوبارہ اٹھتی فرہاد باہر جا چکا تھا۔

وہ فوراً ہی دوبارہ نہ اٹھ سکی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح کانپ رہے تھے۔ جس پر اتنا مان تھا وہ اسے ٹھکرا کر چلا گیا تھا۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"ہاں.... مر جاؤ۔"

اس کا نفرت آمیز لہجہ اس کے دل میں نشتر کی طرح چبھ رہا تھا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے زمین میں دھنسی جا رہی ہے' زندہ درگور ہو رہی ہے' شبنم فرہاد مرتی جا رہی ہے۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں۔

وہ اونچی کوٹھی میں رہنے والی زمین کی پستی میں بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کیا اس کی زندگی میں ٹھوکریں ہی لکھی ہیں؟

ہاں.... ٹھوکریں بہت تھیں مگر زندگی کی ٹھوکریں تھیں۔ آج تک کسی مرد نے اسے ٹھوکر نہیں ماری تھی۔ سب اس کے دیوانے بن کر آتے تھے۔ فرہاد پہلا مرد تھا جو اس طرح ٹھکرا کر گیا تھا۔

اچانک اسے ایک عجیب سی لذت کا احساس ہوا۔

اس نے ایسے ہی محبوب کی تمنا کی تھی جو حاکم بن کر رہے۔

جو اس کی خوشامد نہ کرے بلکہ اپنی محبوبہ سمجھ کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے... . اور وہ ایسی بن جائے۔ ایسی بن جائے کہ یہ کوٹھی چھوڑنے کے لیے تو کیا اگر وہ دنیا چھوڑنے کے لیے کہے تو وہ اس دنیا سے چلی جائے۔

اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے فرہاد سے بحث کیوں کی۔

اس نے خاموشی سے تسلیم کیوں نہیں کیا۔ اسی وقت کیوں نہ سمجھ لیا کہ اس کوٹھی

کی وجہ سے ان کا درمیانی فاصلہ اور بڑھ جائے گا۔

روزانہ اس کے ساتھ چائے پینے والا اس سے اس قدر بیزار ہو گیا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ چائے تک پینا گوارا نہیں کیا۔

وہ جس نے کبھی ایک بار سے دوسری بار اس کا ہاتھ نہیں پکڑا' وہ اسے دھکے دے کر چلا گیا۔ اب کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ فرش پر گری ہوئی عورت کو اٹھانے کے لیے وہ آئے گا۔

وہ پھر رونے لگی۔

اس نے محبت کرنے والے حاکم کی تمنا کی تھی۔ محبت سے حکومت کرنا اور بات ہے۔ نفرت سے منہ پھیر کر چلے جانا اور بات ہے۔

فرہاد کی نفرت اسے کھانے لگی۔

اس کا سخت لہجہ بھلایا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں.... مر جاؤ!"

وہ آواز ابھی تک دیمک کی طرح اسے چاٹ رہی تھی۔

وہ سسکیاں اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ بہت دیر تک روتی رہی۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ آنسو خشک ہو گئے' مگر دل خون ہوتا رہا۔ وہ ایسی نڈھال ہو رہی تھی جیسے سچ مچ اندر سے مرتی جا رہی ہو۔

ملازمہ کئی بار ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس نے دور ہی دور سے اسے ناشتہ کرنے کے لیے کہا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ دوپہر گزر گئی اور کھانے کا وقت آیا تو ملازمہ پھر آئی۔ اس وقت بھی وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سر صوفہ سے ٹکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔

ملازمہ کچھ گھبرائی۔ شبنم کا چہرہ ایسے سرخ ہو رہا تھا جیسے آگ میں تپ رہی ہو۔

"بی بی جی! اٹھئے...." اس نے آگے بڑھ کر اس کے بازو کو تھام لیا۔ پھر گھبرا کر بولی۔

"ہائے اللہ! آپ کو تو بخار ہے۔"

شبنم نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ "اٹھئے بی بی جی! بیڈ روم میں چلئے۔"

اس نے انکار میں سرہلا دیا۔

"ہائے بی بی جی! یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ صبح سے یہاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ چلئے' اپنے کمرے میں چل کر آرام سے لیٹئے۔"

"تم جاؤ۔ میں یہاں آرام سے ہوں.... کتنا آرام ہے یہاں۔"

وہ بیمار آواز میں بڑبڑانے لگی۔

"جہاں وہ مجھے پھینک گئے ہیں' وہیں آرام ہے۔

"میں عورت نہیں ہوں' کوڑے کا ڈھیر ہوں۔ آج انہوں نے یہاں پھینکا ہے کل سڑک کے کنارے پھینکیں گے۔ مگر کل وہ آئیں گے جب کی بات ہے۔ وہ تو اس طرح نفرت کر کے گئے ہیں' جیسے کبھی منہ نہیں دیکھیں گے۔ کہتے تھے مرجاؤ!

"آہ.... مجھے زہر کیا مارے گا۔ ان کی بات نے ہی مار دیا ہے۔ بس یہی ایک جگہ ہے جو انہوں نے مجھے دی ہے۔ مجھے یہیں مرجانے دو۔"

"موت آئے آپ کے دشمنوں کو۔ صاحب ضرور آئیں گے۔ آپ یہاں سے اٹھئے۔ بخار تیز ہو رہا ہے۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔"

ملازمہ نے اسے سہارا دیا تاکہ وہ اٹھ جائے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بڑی آہستگی سے آنکھیں بند کرتی ہوئی بولی۔ "کسی کو فون نہ کرو۔ کسی ڈاکٹر کو نہ بلاؤ۔ میں ایک ایسی بیماری ہوں جسے مرد گلے بھی لگاتے ہیں اور دور بھی بھاگتے ہیں۔ اس بیماری کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔"

اس کی آواز آہستہ آہستہ ڈوبتی جا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہوش و حواس کی دنیا سے دور جا رہی ہے۔

انسان کو جس طرح صدمہ مارتا ہے' اس طرح کوئی بیماری نہیں مارتی۔ سب سے گہری چوٹ دل پر لگتی ہے جسم پر نہیں لگتی۔ اس کا بدن بخار سے نہیں' فرہاد کی نفرت سے جل رہا تھا۔

پھر وہ خاموش ہو گئی۔

ملازمہ نے اسے آواز دی لیکن اس کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ وہ آہستہ آہستہ اسے جھنجوڑ کر پکارتی رہی' اس کی منتیں کرتی رہی لیکن وہ جوں کی توں پڑی رہی۔

ملازمہ نے فون کرنے کے لیے سوچا لیکن اسے کسی ڈاکٹر کا فون نمبر نہیں معلوم تھا۔

وہ اپنی مالکن کو تنہا چھوڑ کر کسی ڈاکٹر کی تلاش میں نہیں جا سکتی تھی۔

وہ بوکھلا کر اِدھر اُدھر یوں دیکھنے لگی جیسے کسی مددگار کو تلاش کر رہی ہو۔ وہ دبلی پتلی کمزور سی عورت تھی' شبنم کو اٹھا کر اس کے کمرے تک نہیں لے جا سکتی تھی۔

اس نے پھر ایک بار اسے چھو کر دیکھا۔ بدن آگ کی طرح جل رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ فی الحال ملازمہ کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ کمرے میں دوڑ کر جائے اور وہاں سے لحاف لا کر اس پر ڈال دے۔

وہ دوڑتی ہوئی کمرے کی طرف گئی پھر رک گئی۔ پورچ میں کار کے رکنے کی آواز آئی تھی۔

وہ پلٹ کر بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔

باہر فرہاد کار سے نکل کر برآمدے کی طرف آ رہا تھا۔

ملازمہ چیخ پڑی۔ "صاحب جی! جلدی چلئے۔ بی بی جی کی حالت بہت خراب ہے۔ صبح سے وہیں پڑی ہوئی ہیں جہاں آپ چھوڑ کر گئے تھے۔ انہیں بہت تیز بخار ہے۔ سردی سے کانپ رہی ہیں۔ مگر اٹھتی نہیں ہیں۔ میں نے کتنی ہی بار منتیں کیں لیکن وہ کہتی ہیں کہ صاحب جہاں پھینک گئے ہیں وہیں مرجائیں گی۔"

فرہاد تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ کر رک گیا۔

شبنم اسی جگہ پڑی ہوئی تھی جہاں وہ اسے دھکا دے کر گیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سیاہ بالوں کے پس منظر میں بخار سے تمتماتا ہوا چہرہ اتنا معصوم اور ایسا ہمدردی کے قابل تھا کہ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ یک بیک اسے احساس ہوا کہ اس نے شبنم پر ظلم کیا ہے جو غصہ برکت علی پر تھا' وہ غصہ اس نے شبنم پر اتارا ہے۔ آخر کیوں؟

شبنم اس کی کیا لگتی تھی؟

کچھ نہیں.... پھر وہ ایک خاوند کی طرح رعب جما کر کیوں چلا گیا تھا؟

اور وہ شبنم کا کیا لگتا تھا؟

کچھ نہیں.... پھر وہ ایک وفادار بیوی کی طرح اسی جگہ کیوں پڑی تھی' جہاں وہ اسے ٹھکرا کر گیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور ایک گھٹنا ٹیک کر اس پر جھک گیا۔

"شبنم!"

اس کے لہجہ میں ایسی نرمی اور ایسی مٹھاس آگئی کہ وہ خود اپنی اس کمزوری پر حیران رہ گیا۔

شبنم کی آنکھیں بدستور بند تھیں اس نے چھو کر دیکھا تو واقعی وہ بری طرح بخار میں تپ رہی تھی۔ اس نے حیرت سے کہا۔

"خدا کی پناہ! یہ کیا پاگل ہو گئی ہے۔ اس حالت میں یہاں پڑی ہوئی ہے۔"

وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھانے لگا۔ ملازمہ نے کہا۔ "آپ نے بی بی جی سے کہا تھا کہ مرجاؤ۔ یہ کہہ رہی تھیں کہ اسی جگہ مرجائیں گی۔"

فرہاد نے اسے اٹھاتے اٹھاتے سینے سے لگا لیا۔ جو عورت اپنے مرد کے ایک حکم پر مرنے کے لیے اس نازک حالت تک پہنچ جائے' اس کی جگہ دل کی دھڑکنوں کے قریب ہوتی ہے۔ جب وہ دونوں بازوؤں میں اسے اٹھا کر لے جا رہا تھا تو شبنم کی چھاتی اس کی چھاتی پر دھڑکتی جا رہی تھی۔

"شب.... نم!"

چلتے چلتے اس نے کانوں کے قریب بڑے پیار سے سرگوشی کی۔

شبنم کی پلکوں میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔

اس نے ملازمہ سے کہا۔ "یہاں سے سڑک کی جانب تیسری کوٹھی میں ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ تم فوراً جاؤ اور اپنے ساتھ لے کر آؤ۔"

ملازمہ وہاں سے چلی گئی۔ فرہاد نے کمرے میں آکر اسے بستر پر ڈالا۔ پھر اسے لحاف میں اچھی طرح لپیٹنے کے بعد آواز دی۔

"شبنم.... آنکھیں کھولو.... شبنم....؟"

وہ بار بار کانوں کے قریب سرگوشی کرتا رہا۔

شبنم کے جسم میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی۔ لحاف کے اندر اس کے دونوں ہاتھ جیسے کانپنے لگے۔ پھر وہ ہاتھ لحاف سے باہر آئے اور اس نے معافی مانگنے کے انداز میں دونوں ہاتھوں کو جوڑ دیا۔

وہ نیم بیہوشی کی حالت میں فرہاد سے معافی مانگ رہی تھی۔ فرہاد نے بے اختیار اسے

اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"مجھے شرمندہ نہ کرو شبنم۔ میں نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اب میں کبھی تمہارا دل نہیں دکھاؤں گا۔"

شبنم ہوش میں نہیں تھی۔ صبح جب ہوش میں تھی' تب ہی اس نے دل میں سوچا تھا کہ وہ اپنے فرہاد سے معافی مانگ لے گی۔ شاید وہ دلی فیصلہ کی قوت تھی کہ نیم بیہوشی کی حالت میں بھی اس کے ہاتھ معافی مانگنے کے لیے اٹھ گئے تھے۔

وہ آگ کی طرح تپ رہی تھی اور شبنم کی طرح ہولے ہولے لرز رہی تھی۔

☆============☆============☆

وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی کچھ اس کی جھکی ہوئی نظروں نے کہا اور کچھ گورے گورے گالوں کی لالی نے کہہ دیا۔

ڈاکٹر ٹیکہ لگا کر اور دوائیں دے کر چلا گیا تھا۔

وہ آنکھیں بند کئے سو رہی تھی۔ بخار کی حالت میں لحاف کافی نہیں تھا۔ اس لئے ہیٹر آن کیا گیا تھا۔ کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ پھر بھی کوئٹہ کی برفانی ہوائیں شدید سردی کا احساس دلا رہی تھیں۔

فرہاد ہیٹر کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ رات کے نو بج گئے تھے اور وہ ابھی تک گھر واپس نہیں جا سکا تھا۔ شبنم کا بخار کبھی چڑھتا تھا اور کبھی اترتا تھا۔ کبھی وہ جاگتی تھی اور کبھی سوتی تھی۔ وہ ایسی حالت میں اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

اگر وہ بھلی چنگی ہو کر اٹھ بیٹھتی تو کیا وہ یہاں سے چلا جاتا؟

یہ سوال اس نے اپنے دل سے کیا۔ دل نے کہا' نہیں جا سکتا تھا۔ پاؤں میں ایک ایسی زنجیر پڑ گئی ہے جسے وہ دیکھ نہیں سکتا صرف محسوس کر سکتا ہے۔

ہیٹر کی سرخ روشنی اس کے چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر بھی آگ جل رہی ہے۔

آگ کو چھونے سے آدمی جل ہی جاتا ہے۔ اب سے پہلے اس نے شبنم کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ بازوؤں میں اسے اٹھاتے ہی وہ جل جائے گا۔

اسے اپنے سینے پر اب تک شبنم کے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ یہ کیسی ادا تھی کہ جہاں اس نے ٹھکرایا تھا' وہاں وہ صبح سے شام تک بخار کی حالت میں پڑی رہی؟ یہ ادا تھی یا ایک عورت کی عبادت تھی؟

اس نے گردن گھما کی شبنم کی طرف دیکھا۔ دوسری گھریلو عورتوں کی طرح وہ بھی ایک عورت تھی۔ اس کے چہرے پر دور دور تک گناہ کی سیاہی نہیں تھی۔ اس لئے نہیں تھی کہ وہ اندر سے میلی نہیں تھی۔ لوگوں نے اسے باہر سے لوٹا تھا۔ اس کے باطن تک کوئی نہیں پہنچ سکا تھا۔

فرہاد کو افسوس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ اس کوٹھی مین رہنے پر اعتراض کیا تھا۔ وہ یہاں نہیں رہے گی تو اور کہاں جائے گی؟

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس نے جو کچھ پایا اسے رکھ لیا جو کھویا اس کے لیے فریاد نہیں کی۔ لوٹنے والے اس کی لوٹی ہوئی چیز واپس نہیں کر سکتے تھے۔ پھر وہ اپنے نام لکھی ہوئی کوٹھی کیسے واپس کر سکتی تھی۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجنا چاہیے۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ پہلے لوٹنے والوں کا محاسبہ کیا جائے۔ پھر ایک عورت کو گھر سے بے گھر کیا جائے۔

فرہاد نے ایک مظلوم عورت کے نقطہ نظر سے جتنا سوچا' اتنا ہی شبنم کو حق بجانب پایا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بستر کے قریب آگیا۔

شبنم کراہتی ہوئی کروٹ بدل رہی تھی۔ فرہاد نے اسے چھو کر دیکھا تو بخار کم تھا۔ اس کے چھوتے ہی شبنم کی آنکھ کھل گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ بے خیالی میں اسے تکتی رہی۔ وہ فوراً ہی سمجھ نہ سکی کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ فرہاد کو عین نگاہوں کے سامنے دیکھ کر شاید وہ سوچ رہی تھی کہ یہ حقیقت نہیں ہے' خواب ہے۔ وہ سنگدل تو صرف خوابوں میں آسکتا ہے۔

بخار اور نیند کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ گئے تھے۔ ان نیم باز آنکھوں میں ایسا خمار چھایا ہوا تھا کہ فرہاد ان میں ڈوبتا چلا گیا۔

شبنم کو یاد نہیں تھا کہ وہ اپنے محبوب سے معافی مانگ چکی ہے۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔ اب میں آپ سے بحث نہیں کروں گی۔ یہ کوٹھی چھوڑ دوں گی۔ آپ جو کہیں گے' وہی کروں گی۔"

فرہاد نے پلنگ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "نہیں' اب میں تمہیں کوٹھی چھوڑنے کے لیے نہیں کہوں گا۔ جب تمہارا کوئی گھر نہیں ہے تو پھر تم کہاں جاؤ گی۔ کوٹھی اسی وقت چھوڑ سکتی ہو۔ جب کوئی تمہیں اپنے گھر کی عزت بنا کر لے جائے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "میں نے یہ خواب دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔"

فرہاد نے کہا۔ "عورت جب تک سہاگن نہیں بنتی' خواب دیکھتی رہتی ہے اور اپنے

خوابوں میں کتنی ہی صورتیں تراشتی رہتی ہے۔ تمہارے خوابوں میں بھی کتنی ہی صورتیں بنتی رہیں اور بگڑتی رہیں۔ اگر ان میں میری صورت ہو تو بتا دو۔"

شبنم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں۔ ہائے فرہاد! میں کیسے کہوں کہ میرے خوابوں میں تم ہی تم ہو۔ اب تک جو بھی آیا' میری دنیا میں آیا۔ دل میں نہیں آیا۔ میرے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو۔ یہ صرف تمہارے لئے دھڑک رہا ہے۔ اور تمہارے ہی لئے اس نے مجھے بیمار بنا ڈالا ہے۔

وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ کچھ اس کی جھکی ہوئی نظروں نے کہا اور کچھ گورے گورے گالوں کی لالی نے کہہ دیا۔

فرہاد اس پر جھک گیا۔

"تمہاری خاموشی کا مطلب کیا سمجھوں؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔

فرہاد بالکل قریب چلا آیا۔ دونوں کے چہروں کے درمیان نازک سی ہتھیلیوں کا پردہ تھا۔

"یہ پردہ ہٹا دو!" اس نے سرگوشی میں کہا۔

اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "میں.... میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ آپ مجھے اپنی عزت بنانا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی کنیز بن کر رہوں گی۔ مم.... مگر آپ میری ایک بات مان لیجئے۔"

"کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ "یہ بستر' یہ کمرہ.... یہ کوٹھی آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ مجھ سے آپ کی عزت نہیں بنے گی۔ آپ سے میری عزت بڑھے گی۔ آپ مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے یہاں سے کہیں دور لے جائیے۔ اس کوٹھی میں ایمانداری سے رشتہ نہیں ہو سکتا...."

فرہاد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "تم نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ میں کل ہی دوسرا مکان تلاش کروں گا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اس کوٹھی کا کیا ہو گا؟"

"جو آپ فیصلہ کریں گے۔"

فرہاد نے مسکرا کر کہا۔ "فیصلہ کیسے کروں؟ کس کے سامنے کروں؟ تم تو چھپی ہوئی ہو' یہ اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹاؤ؟"

اس نے آہستہ آہستہ چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لئے لیکن نظریں نہ ملا سکی۔ پلکیں جھکی رہیں اور نصف چہرہ تکیہ میں چھپا رہا۔

فرہاد نے کہا۔ "مجھ پر فیصلہ چھوڑو گی تو بہت سا نقصان برداشت کرنا ہوگا۔"

اس نے جواب دیا۔ "نفع اور نقصان بزنس پارٹنر سوچتے ہیں۔ آج سے میں آپ کی بزنس پارٹنر نہیں ہوں۔"

"یعنی صرف لائف پارٹنر ہو؟"

شبنم نے ہاں کے انداز میں سرہلا دیا۔ فرہاد نے کہا۔ "اچھی بات ہے تو پھر یہ کوٹھی ہم فروخت کر دیں گے۔ جو رقم ملے گی وہ کسی فلاحی ادارے میں دے دیں گے۔ منظور ہے؟"

اس نے پھر اثبات میں سرہلا دیا۔

"تمہارے تمام زیورات اور نقد روپے بھی کسی نیک کام میں خرچ کئے جائیں گے۔ ہم نے کاروبار میں جو منافع حاصل کیا ہے' صرف اسی منافع سے اپنا کاروبار کو آگے بڑھائیں گے۔

"اتنی بڑی دولت اور جائیداد کو چھوڑ دینا بظاہر ایک احمقانہ بات ہے لیکن اس سے ہمارا ضمیر مطمئن ہوگا۔ ہم نیکی اور ایمانداری کی بنیاد پر اپنی ازدواجی زندگی کی ابتداء کریں گے۔

"میں اس بات پر فخر کروں گا کہ تم نے میری خاطر دولت اور جائیداد کو ٹھکرا دیا ہے تم اس بات پر ناز کرو گی کہ میں نے بھی تمہیں اپنانے کے لیے صرف تمہاری تمنا کی ہے اور اپنی محنت سے تمہارے لیے ایک گھر بنایا ہے۔"

وہ زیر لب مسکرانے لگی۔ دل مسرت سے لبریز تھا کہ فرہاد اس کے لیے گھر بنائے گا۔ اسے ایک خاوند کی محبت دے گا۔ اس گھر میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوں گی' چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے بچے ہوں گے۔ فرہاد کے یہ بچے اس کی کوکھ میں پرورش پائیں

گے اور اس کی گود میں کھیلیں گے۔

کتنا سہانا سپنا ہے یہ۔ جب وہ اپنے فرہاد کو ایک ننھے منے بچے کا تحفہ دے گی تو اس وقت فخر سے کہے گی کہ عورت صرف کھلونا نہیں ہے۔ اس دنیا کی تخلیق کا پہلا دروازہ ہے۔

اس نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ فرہاد کے ہاتھوں میں دے دیا۔

☆============☆============☆

میں مجرم ہوں۔ مجھے سزا ملنی چاہئے۔ بیٹے کے ہاتھوں سے سزا ملے گی تو دوسرے بھی عبرت حاصل کریں گے۔

عزت آراء اور نواز صاحب دفتر کے کاموں میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگے۔

صبح سے شام تک کا وقت اتنی تیزی سے گزر جاتا تھا جیسے وقت کو پر لگ گئے ہوں۔ جاڑے کے دن یوں بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے بھی چھوٹے نہیں ہوتے کہ ادھ نواز صاحب دفتر میں آئے اور ادھر شام ہو گئی۔ ویسے عزت جانتی تھی کہ وقت کہیں نہیں جاتا۔ وہ سارے کا سارا وقت نواز صاحب ہتھیا کر لے جاتے ہیں۔

ناصرہ پروین اور فرزانہ فہیم محسوس کر رہی تھیں کہ نواز صاحب کچھ بدل گئے ہیں۔ سنجیدگی تو ان میں اب بھی تھی لیکن وہ مالکانہ مزاج نہیں تھا۔ وہ دفتر میں باس بن کر نہیں آتے تھے۔ رسالہ کے مضامین کے علاوہ دوسرے مسائل پر بھی گفتگو کرتے تھے۔ کبھی کبھی مسکراتے بھی تھے اور رسالے میں شائع ہونے والے لطیفوں کا انتخاب کرتے وقت انہیں پڑھ کر قہقہے بھی لگاتے تھے۔

صفدر صاحب نے بڑے اطمینان سے فیصلہ سنا دیا کہ پتھر کو جونک لگ رہی ہے۔

فرزانہ فہیم کا خیال تھا کہ وہ سرنڈر کر گئے ہیں یعنی ماہنامہ "عزت" کا مسلسل مطالعہ کرنے کے بعد کسی حد تک عورت کے مزاج کو سمجھ گئے ہیں۔

ناصرہ پروین ابھی دفتری ماحول کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی، سونگھ رہی تھی، اپنی رائے پیش کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ پھر بھی عورت تھی خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ خاموشی کے باوجود اتنا کہہ گئی کہ بہت جلد کوئی چونکا دینے والی خبر ملے گی۔

بہرحال اس دفتر میں زندگی کی ایک نئی اور انجانی سی حرارت پیدا ہو گئی تھی۔ وہاں بظاہر سب ہی انجان سے بنے ہوئے تھے اور بڑے بھولپن سے نگاہوں کی چوری کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر وہ دونوں بڑے ہی چور ثابت ہو رہے تھے۔ چیونٹی بھی چلتی ہے تو آگے ذرا اور آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ پتہ نہیں وہ کیسی چال چل رہے تھے کہ دیکھنے سمجھنے اور شبہ کرنے والوں کو مایوس کرتے جا رہے تھے۔

عزت آرا سمجھ میں آتے آتے بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ نواز صاحب کی باتوں پر کبھی مسکراتی تھی اور کبھی پریشان ہو جاتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بہت سے نازک جذبوں کی عکاسی کرتی تھی اور اس کی پریشانی بہت سے سہمے ہوئے تجربوں کی مظہر بن جاتی تھی۔

اگلا پرچہ پریس جانے سے پہلے ہی اس نے کام کو اتنا آگے بڑھا دیا کہ دفتری اوقات کے بعد اسے رات گئے تک رکنے اور گھر تک پہنچانے کے لیے نواز صاحب کو زحمت دینے کی ضرورت نہ رہی۔

اس بات کو نواز صاحب نے محسوس کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ان سے کترا رہی ہے۔ انہوں نے ناگواری سے سوچا کہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ ان عورتوں کے نخرے سمجھ میں نہیں آتے۔ بعض اوقات بالکل ہی معمہ بن جاتی ہیں۔

نواز صاحب اس معمہ کو حل کرنے کی بجائے خود بھی کترانے لگے۔ اپنی طرف سے بھی بے نیازی کا ثبوت دینے لگے۔

صفدر صاحب نے انہیں سمجھایا۔ "سارا قصور آپ کا ہے۔ اس رات عزت صاحبہ نے آپ کو چائے کی دعوت دی تھی لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ اب ان کی ناراضگی بجا ہے۔"

"ناراض ہیں تو ہوتی رہیں۔ کیا میں چائے پی کر اپنی نیند خراب کر لیتا؟"

صفدر صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔ "ٹھیک ہے کہ آپ نے چائے نہیں پی۔ مگر ایمان سے کہئے کیا اس رات نیند آگئی تھی؟"

نواز صاحب جواب نہ دے سکے۔ ریوالونگ چیئر پر گھوم کر وہ کہیں دور کھو گئے۔ شاید انہیں بھولا ہوا رت جگا یاد آ رہا تھا۔

شام کو ہیڈ کاتب نے کاپیاں جوڑنے میں دیر کر دی۔ صفدر صاحب کی سازش تھی، دیر تو ہونی ہی تھی۔ کام ختم ہونے سے پہلے ہی وہ فرار ہو گئے۔ ہیڈ کاتب نے کہیں قریب ہی اپنے کسی عزیز کے ہاں جانے کا بہانہ کیا اور عزت تنہا رہ گئی۔

جب وہ دونوں دفتر سے چلے تو پھر اسی شیشوں کے قفس میں تنہا تنہا سے تھے۔

صدر سے آگے بڑھتے ہی عزت نے کہا۔ "کار روک دیجئے۔ میں نے ڈرگ کالونی کا مکان چھوڑ دیا ہے۔ یہاں سے ٹیکسی میں چلی جاؤں گی۔"

انہوں نے کار روک دی۔ "آپ ٹیکسی میں کیوں جائیں گی؟ کیا میں نئے مکان تک نہیں پہنچا سکتا؟"

وہ ذرا ہچکچائی پھر کہنے لگی۔ "آپ کی یہ شاندار گاڑی میرے نئے مکان تک نہیں جا سکتی۔ آپ ملازمت کرنے والی لڑکیوں کی دشواریوں کو نہیں سمجھ سکتے کہ ہمیں کتنی بدنامیوں سے بچ کر چلنا پڑتا ہے۔

"کرائے کی ٹیکسی کو محلے والے نظرانداز کر دیتے ہیں لیکن کوئی بہت بڑا آدمی، بہت بڑی کار میں چھوڑنے آئے تو لوگ کتنے ہی اسکینڈل تراشنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بھائی بی اے پاس ہے اسے برسوں کے بعد کوئی کاروبار ملا ہے مگر بہن کو ہر جگہ آسانی سے ملازمت مل جاتی ہے۔ وہ میری صلاحیتوں کو نہیں دیکھتے میری عمر کو دیکھ کر شرمناک الزامات عائد کرتے ہیں۔

"ہم عورتیں دوسروں کے سوچنے کا انداز نہیں بدل سکتیں۔ اس لئے مکان بدل لیتی ہیں۔ کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں بہت سے محلوں میں بہت سے مکانات ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں پھر کوئی مکان تبدیل کروں تو چلئے مجھے وہاں تک چھوڑ آیئے۔"

نواز صاحب سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔

ان کا ذہن آئینہ کی طرف صاف ہو گیا تھا۔

عزت آراء کے کترانے کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

اور اب یہ حقیقت بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ لڑکیاں ملازمت کے لیے مجبور ہو کر گھر کی چاردیواری سے باہر نکلتی ہیں تو انہیں کیسی کیسی جھوٹی تہمتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

عزت کار کا دروازہ کھول کر کسی ٹیکسی کی تلاش میں چلی گئی۔

انہوں نے اسے نہیں روکا۔ اسے مزید بدنام کرنے کے لیے وہ اس کے نئے مکان تک نہیں جا سکتے تھے۔ اس لئے وہ گم صم بیٹھے رہے اور عزت کے مسئلہ پر بڑی سنجیدگی سے غور کرتے رہے۔

کچھ عورتیں ہوتی ہیں جو بدنامیوں کو قبول کر لیتی ہیں۔ چار سو روپے کی ملازمت کرتی ہیں اور آٹھ سو روپے کے شاندار فلیٹ میں رہتی ہیں۔ ایسی عورتوں نے ملازمت کرنے والی دوسری خواتین کو بدنام کر رکھا ہے۔ اچھے اور برے چہرے آسانی سے پہچانے

نہیں جاتے۔ انہیں بہت قریب سے دیکھنا پڑتا ہے۔ بہت عرصہ تک مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر ملازمت کی دلدل میں کنول جیسے پاکیزہ چہرے نظر آتے ہیں۔

نواز صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ سامنے ونڈ اسکرین پر عزت کا چہرہ کنول کی طرح کھل رہا تھا۔ اس کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ تھی اور وہ جھکی جھکی نظروں سے اور دل موہ لینے والی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ حسین چہرہ کسی دوسرے چہرے میں گڈمڈ ہونے لگا۔ کسی بوڑھے مرد کا چہرہ تھا جو عزت کے خیالی چہرے پر حاوی ہو رہا تھا۔

وہ اپنے خیالات سے چونک گئے۔ ایک بوڑھا ونڈ اسکرین کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا۔ وہ کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کو کھجاتا ہوا کھڑکی کے قریب آ گیا اور ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا۔

"حضور! میں بھکاری نہیں ہوں۔ خانپور سے اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ یہاں کام کی تلاش میں آیا ہوں۔ میرے بیوی بچے وہاں فٹ پاتھ پر صبح سے بھوکے پڑے ہیں۔ اللہ کے نام پر ایک وقت کی روٹیاں کھلا دیجئے۔"

ایسے پیشہ ور بھکاری آئے دن راہ گیروں کا راستہ روک کر ایسی من گھڑت کہانیاں سناتے ہیں۔ نواز صاحب کو اس سے دلچسپی نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بھولا ہوا چہرہ یاد کر رہے ہوں۔

بکھرے ہوئے بال' بڑھی ہوئی داڑھی۔ جمی ہوئی گرد نے پرانے چہرے کو چھپا رکھا تھا۔ کھڑکی کے فریم میں جڑے ہوئے چہرے کو دیکھ کر انہیں یاد آ رہا تھا کہ ایسا ہی چہرہ ان کے البم میں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ بوڑھا تھا اور البم میں جو تصویریں تھیں ان میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔

بوڑھے نے پھر ایک وقت کی روٹیوں کا سوال کیا۔ نواز صاحب نے اسے ناگواری اور ہمدردی کی ملی جلی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"سلیم احمد!"

اچانک نواز صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ انہوں نے بڑی ناگواری سے دیکھتے

ہوئے کہا۔ "بیوی بچے کہاں ہیں؟ انہیں یہاں لے آیئے۔ روٹی مل جائے گی۔"

وہ دعائیں دیتا ہوا جلدی سے پلٹ کر دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر چلا گیا۔ نواز صاحب اسے دیکھ رہے تھے۔ دور ایک عورت چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور اس کے قریب ایک چھ سال کا لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ بوڑھے نے اس عورت سے کچھ کہا۔ پھر وہ تینوں کار کی طرف آنے لگے۔

ان کے قریب آتے ہی انہوں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کہا۔ "بیٹھ جایئے!"

بوڑھے نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "حضور! ہم اس گاڑی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہیں۔ آپ ہمیں یہاں کسی ہوٹل سے روٹی کھلا دیجئے۔"

"روٹی کسی ہوٹل سے نہیں' میرے گھر سے ملے گی۔ بیٹھ جایئے۔"

وہ تینوں سمٹ سمٹا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

نواز صاحب نے کار اسٹارٹ کی۔ پھر کار کے اندر روشنی کی اور چھوٹے سے آئینہ کو ایسے زاویئے پر رکھا کہ اس میں بوڑھے کا چہرہ نظر آنے لگا۔

"جناب آپ کتنی دور لے جائیں گے؟"

نواز صاحب نے جواب دیا۔ "پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے دوری نہیں دیکھی جاتی ہے۔"

بوڑھا خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد نواز صاحب نے پوچھا۔ "آپ آگرہ کے رہنے والے ہیں؟"

"جی ہاں! مم.... مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

انہوں نے دوسرا سوال کیا۔ "پاکستان بننے کے بعد آپ آگرہ سے کراچی آئے ہوں گے؟"

"جی ہاں!"

"پھر آپ خانپور کیسے چلے گئے؟"

"وہ.... وہ.... بس جی یونہی.... کچھ خاندانی جھگڑے ہو گئے تھے۔ اس لئے میں یہ شہر چھوڑ کر چلا گیا۔"

"اب آپ کے خاندان والے کہاں ہیں؟"

"پتہ نہیں۔ بائیس برس گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں سب ادھر ادھر ہو گئے ہیں کسی کا پتہ نہیں چلتا کہ کون کہاں ہے؟"

کار ایک کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گئی۔ ایک ملازم دوڑتا ہوا قریب آیا۔ انہوں نے کہا۔ "ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں لے جا کر پیٹ بھر کر کھلاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کوٹھی کے اندر چلے گئے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ صوفہ پر گر پڑے اور دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا کر یوں بیٹھ گئے جیسے اپنی موجودہ زندگی سے شرما رہے ہوں۔

بوڑھے کا چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کا نام سلیم احمد تھا۔ آگرے کا رہنے والا تھا۔ پھر وہ آگرے سے کراچی آیا تھا۔ نام بھی وہی تھا۔ مقامات بھی وہی تھے اور چہرہ بھی جانا پہچانا تھا۔

وہ اٹھ کر الماری کے پاس آئے۔ اسے کھول کر انہوں نے ایک پرانا البم نکالا اور اس کے ورق الٹ الٹ کر تصویریں دیکھنے لگے۔

وہ تصویریں سلیم احمد کے چہرے کو زیادہ سے زیادہ واضح کرتی جا رہی تھیں۔

انہوں نے چند تصویریں نکال کر البم کو الماری میں رکھ دیا اور کمرے سے باہر آ گئے۔

زینے کے نیچے ڈرائنگ روم تھا۔ اس کے بعد ڈائننگ ہال تھا۔ جہاں وہ تینوں بیٹھے ہوئے مرغن غذائیں کھا رہے تھے۔

سلیم احمد کھانے کے بعد پانی پی کر ڈکار لیتے ہوئے نواز صاحب کو دعائیں دینے لگا۔

نواز صاحب اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور اس کی جانب ایک تصویر بڑھا کر بولے۔ "آپ اس تصویر کو پہچانتے ہیں؟"

سلیم احمد نے اس تصویر پر ایک نظر ڈالی پھر حیرانی سے بولے۔ "یہ.... یہ تو میری تصویر ہے.... آپ.... آپ کے پاس کہاں سے آئی؟"

انہوں نے دوسری تصویر بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کے ساتھ کس خاتون کی تصویر ہے؟"

"یہ.... یہ میری بیوی ہے۔"

نواز صاحب نے اس کے قریب بیٹھی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "تو پھر یہ آپ کی کون ہے؟"

"یہ میری دوسری بیوی ہے۔ پہلی کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"انتقال ہو چکا ہے...." نواز صاحب اداس ہو گئے۔

سلیم احمد نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ میری اور میری بیوی کی تصویریں آپ کے پاس کیسے آ گئیں؟"

انہوں نے اداسی سے کہا۔ "پہلے یہ بتائیے کہ پہلی بیوی سے کتنی اولادیں تھیں اور وہ کہاں ہیں؟"

"اولاد؟"

وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچانے لگا پھر اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "اس بیوی سے.... کوئی.... کوئی اولاد نہیں تھی۔"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں۔"

نواز صاحب نے اتنی زور سے میز پر ہاتھ مار کر کہا کہ سلیم احمد اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"یاد رکھئے۔ آپ مجھ سے جھوٹ بول کر یہاں سے نہیں جا سکیں گے۔ میں آپ کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔ پہلی بیوی سے آپ کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا تھا اور دوسری لڑکی تھی۔ آپ شروع سے ہی اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی زندگی تباہ کرتے رہے ہیں۔

"آپ ایک معمولی بس ڈرائیور تھے۔ آپ جو کماتے تھے۔ اسے شراب اور جوئے میں لٹا دیتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں آپ کے بیوی بچے دو دو وقت کے فاقے کرتے تھے۔ بچوں کے نانا جان سے ان کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے روپے پیسے سے مدد کی اور لڑکے کو اپنے ہاں لے گئے۔ تاکہ اسے اعلیٰ تعلیم دلا کر کسی قابل بنا سکیں۔ وہ اپنی نواسی کو بھی اپنے ساتھ لے آتے لیکن وہ ایک سال کی تھی اور اپنی ماں کا دودھ پیتی تھی۔

"انہوں نے سوچا تھا کہ بچی بڑی ہو گی تو وہ اسے بھی اپنے ہاں لے آئیں گے کیونکہ آپ کے ہاں کوئی تہذیب نہیں تھی۔ کوئی شرافت نہیں تھی۔ آپ جاہلوں کی طرح زندگی گزارتے تھے اور جاہلوں کی طرح آپ نے اپنے بچوں کے نام رکھے تھے۔ بیٹے کو ناجو کہتے تھے اور بیٹی کو شبراتن...."

سلیم احمد منہ کھولے اور دیدے پھاڑے حیرانی سے دیکھے جا رہا تھا۔

نواز صاحب نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"مجھے یہ بات کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ یہ نانا جان کی مہربانیاں تھیں کہ میں ناجو سے نواز احمد درانی بن گیا ہوں۔"

سلیم احمد یکبارگی تڑپ کر آگے بڑھا۔

"میرے بچے' میرے بیٹے' تم.... تم میرے بیٹے ہو۔"

نواز صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ٹھہریئے۔ میرے قریب مت آیئے۔ مجھے بیٹا کہنے سے پہلے سچ سچ بتایئے کہ میری امی اور میری بہن کہاں ہیں۔"

اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہونے لگی۔ نواز صاحب نے کہا۔ "آپ ایک بار جھوٹ بول چکے ہیں کہ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ میں دوسری بار کوئی جھوٹ نہیں سننا چاہتا۔"

سلیم احمد جھکے ہوئے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔ "تمہاری ماں مجھ سے روٹھ کر چلی گئی۔ وہ اپنے ساتھ تمہاری بہن کو بھی لے گئی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔ میں نے انہیں کبھی تلاش نہیں کیا۔"

"ایسی باتیں کہتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔ آپ نے میری امی کی اور میری ننھی منی بہن کی زندگی برباد کر دی۔ انہیں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ میں انہیں کہاں تلاش کروں؟ آپ یہ شہر چھوڑ کر امی کے ساتھ کیوں چلے گئے تھے؟ وہ کون سی مجبوری تھی کہ آپ یہاں سے منہ چھپا کر بھاگ گئے تھے؟"

"میں.... قرضوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ اس لئے یہ شہر چھوڑ کر...."

نواز صاحب نے گرج کر کہا۔ "آپ پھر جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ نانا جان کے ہاں سے دس ہزار روپے چرا کر بھاگے تھے۔"

سلیم احمد کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ کچھ بڑھاپے کی وجہ سے اور کچھ اپنے جرم کی وجہ سے وہ بری طرح لرز رہا تھا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں جھوٹ نہیں سننا چاہتا لیکن آپ بار بار جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں آپ کو پھر سمجھاتا ہوں کہ میرے سامنے سچ بولئے ورنہ میں باپ بیٹے کے رشتے کا لحاظ کئے بغیر آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "میں مجرم ہوں مجھے سزا ملنی چاہیے۔ بیٹے کے ہاتھوں سزا ملے' تو دوسرے بھی عبرت حاصل کریں گے۔

"بیٹا! تمہاری ماں ایک نیک اور وفادار عورت تھی۔ وہ جب تک میرے ساتھ رہی' میرے ظلم و ستم برداشت کرتی رہی۔ ایک رات میں نے اچانک یہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ تمہاری ماں نے کہا کہ تمہارے نانا جان کو زمینوں پر سے واپس آنے دو' پھر ہم چلے جائیں گے تم اس وقت آٹھ برس کے تھے اور اپنے نانا کے ساتھ زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اسی رات کیوں بھاگنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ اگر وہ میرے ساتھ نہیں جائے گی تو پھر میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔

"وہ خاوند کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ تمہیں اس لئے چھوڑ دیا کہ تم بچپن ہی سے نانا کے پاس رہتے تھے۔ میرے مجبور کرنے پر اس نے سوچا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر واپس آ جائے گی۔

"لیکن اسے واپس آنے کا موقع نہیں ملا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ میں اس کے باپ کے ہاں سے دس ہزار روپے چرا کر لایا ہوں اور اسے اس لئے ساتھ لایا ہوں کہ چوری کا الزام ہم دونوں پر آئے۔ اگر مجھے سزا ملے گی تو اسے بھی ملے گی۔ اگر اسے معاف کیا جائے گا تو مجھے بھی معاف کر دیا جائے گا۔

"وہ دوسرے ہی دن واپس جانے کے لیے ضد کرنے لگی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دس ہزار ختم ہونے سے پہلے تمہارے نانا کو ہمارا پتہ ملے۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ اپنے باپ کے پاس جائے گی تو میں اسے طلاق دے دوں گا اور کہیں ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں کوئی مجھے تلاش نہیں کر سکے گا۔

"میری دھمکی کارگر ہوئی۔ وہ سارے رشتوں کو توڑ سکتی تھی لیکن مجھ سے طلاق نہیں لے سکتی تھی۔ وہ رو دھو کر بیٹھ گئی اور فیصلہ کر لیا کہ دس ہزار ختم ہونے کے بعد

ملزمہ کی حیثیت سے باپ کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔

"ایک سال تک میں ان روپوں سے عیش کرتا رہا۔ روپے ختم ہو گئے تو پھر ادھر ادھر ڈرائیور کی نوکری کرنے لگا۔ میں راتوں کو شراب پی کر آتا تھا اور اس سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔

"شبراتن چودہ برس کی ہو گئی تھی۔ اس کی ماں مجھے سمجھاتی تھی کہ لڑکی جوان ہو رہی ہے' مجھے بری عادتیں چھوڑ دینی چاہئیں لیکن مجھ پر اس کے سمجھانے کا اثر نہ ہوا۔ ایک رات میں ایک بازاری عورت کو گھر لے آیا۔ اس نے میرے ہر ظلم و ستم کو برداشت کیا لیکن سوکن کو برداشت نہ کر سکی اور شبراتن کو لے کر گھر سے چلی گئی۔

اس کے بعد ان دونوں کا پتہ نہیں چلا بلکہ وہ میرا پتہ نہ لگا سکے کیونکہ میں جگہ چھوڑ کر خانپور چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے اس غریب عورت سے شادی کی اور تب سے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں۔"

نواز صاحب نے نفرت سے کہا۔ "آپ ساری زندگی ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔ تب بھی مجھے آپ سے ہمدردی نہیں ہوگی۔ میں صرف اخلاقاً آپ کو برداشت کر رہا ہوں۔ آپ کو پولیس کے حوالے بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے میری ہی بدنامی ہو گی نانا جان زندہ ہوتے تو وہی آپ کو سزا دیتے۔

"یہ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ آپ سڑکوں پر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ یہاں میرا نام ہے' عزت ہے۔ کسی کو معلوم ہو گیا کہ میرا باپ بھیک مانگتا تھا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔

"بہرحال آپ کو تو اب یہاں پناہ مل جائے گی کیونکہ میں آپ کی وجہ سے اپنی سوسائٹی میں تماشہ نہیں بننا چاہتا لیکن میں امی اور شبراتن کو کہاں تلاش....

"لاحول ولا قوۃ آپ نے کیسا تھرڈ کلاس نام رکھا ہے۔ شبراتن کوئی نام ہوتا ہے۔ اس نام سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ ایسے نام والے کتنے نچلے درجہ کے لوگ ہوتے ہیں۔

"آپ.... آپ میری بہن کے متعلق بتائیے کہ وہ کیسی ہے؟ کوئی بھائی بچھڑ جائے یا بوڑھے والدین بچھڑ جائیں تو صرف صدمہ ہوتا ہے لیکن جوان بہن بچھڑ جائے تو صدمہ بھی ہوتا ہے اور پریشانی بھی۔ دل میں یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کی عزت پر آنچ

نہ آ جائے۔ بیٹیوں اور بہنوں سے خاندان کی عزت ہوتی ہے لیکن یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ مجھے شبراتن.... نہیں.... اسے شبراتن نہیں شبو کہئے' آپ مجھے شبو کے متعلق کچھ بتائیے۔"

"میں کیا بتاؤں بیٹا۔ اس سے بچھڑے پورے سات برس ہو گئے۔ جب وہ چودہ برس کی تھی۔ تب میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی جیسے گدڑی میں لعل ہوتا ہے۔ اگر اس کوٹھی میں آ کر ریشمی لباس پہن لے تو کسی ریاست کی شہزادی لگے گی۔"

باپ بیٹی کی تعریفیں کر رہا تھا اور نواز صاحب اپنی بہن کا ایک خیالی خاکہ اپنے ذہن میں بنا رہے تھے۔ کتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ انہوں نے ماں کی محبت اور بہن کا پیار نہیں دیکھا تھا۔ سب جیتے جی بچھڑ گئے تھے۔ وہ بھی رشتے داروں سے ایسے بدظن ہو گئے تھے کہ نانا کی وفات کے بعد تمام عزیز و اقارب سے دور کی دوستی رکھی تھی۔ کبھی عید شب برات کے موقعوں پر ان سے مل لیا کرتے تھے۔

لیکن آج باپ کو دیکھ کر یہ امید ہو گئی تھی کہ ماں اور بہن بھی مل سکتی ہیں۔ ان کے دم سے اس کوٹھی کی ویرانی دور ہو سکتی ہے۔ انہوں نے پوچھا۔ "آپ نے آخری بار انہیں کہاں چھوڑا تھا؟"

"کوٹری میں۔"

انہوں نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم ابھی کوٹری جائیں گے۔ آپ آدھے گھنٹے کے اندر غسل کر کے کپڑے تبدیل کیجئے۔"

انہوں نے ملازم کو بلایا اور اس سے کہا کہ سلیم احمد کو الماری سے کوئی لباس پہننے کے لیے دے دے اور ان کے لیے ایک کمرہ کھول دے۔

ان کے جانے کے بعد نواز صاحب نے اپنی سوتیلی ماں کی جانب دیکھا اور کہا۔ "اس وقت میں کوٹری جا رہا ہوں۔ صبح آپ کے اور بچے کے کپڑے بازار سے آ جائیں گے۔"

سوتیلی ماں نے سر جھکا کر کہا۔ "بیٹا! جب انہوں نے مجھ سے نکاح کیا تو مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میں کسی پر سوکن بن رہی ہوں۔ یہ بات مجھے آج معلوم ہوئی ہے۔ میں تمہارے سامنے شرمندہ ہوں کہ تمہاری امی کی سوکن بن گئی ہوں۔"

نواز صاحب نے نرمی سے کہا۔ "آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ غلطی میرے ابا جان کی

ہے۔ بہرحال اس غلطی کو شرافت سے نبھانا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ آپ یہاں اطمینان سے رہیے۔ میں اپنی امی کی طرح آپ کی عزت کروں گا اور آپ کی ہر ضرورت کا خیال رکھوں گا۔"

"یہ تمہاری شرافت اور سعادت مندی ہے بیٹا۔ ورنہ لوگ تو سوتیلی ماں کے نام سے ہی نفرت کرتے ہیں۔"

"آپ کو مجھ سے نفرت نہیں ملے گی۔ آیئے' اپنے کمرے میں چلیے۔"

وہ ان کے ساتھ اس کمرے میں آ گئیں جو سلیم احمد کے لیے کھولا گیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ سلیم احمد کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کوٹری کی طرف روانہ ہو گئے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے وہ کوٹری پہنچے تو اس چھوٹے سے شہر کے لوگ نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سلیم احمد انہیں بابو لوہار کے مکان پر لے گیا۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک شخص باہر آیا۔ وہ بابو لوہار نہیں تھا۔ سلیم احمد اسے پہچانتا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "کیا بابو لوہار یہاں نہیں رہتا ہے؟"

"نہیں جی' میں یہاں دو سال سے رہتا ہوں۔ شاید مجھ سے پہلے رہتا ہو گا میں نہیں جانتا۔ وہ سامنے والے مکان میں ایک بڑھیا رہتی ہے۔ وہ اس محلے کی پرانی عورت ہے۔ اس سے پوچھ لیجئے۔"

سلیم احمد سامنے والے دروازے پر جا کر دستک دینے لگا۔ بہت دیر تک دروازہ پیٹنے کے بعد ایک بڑھیا بڑبڑاتی ہوئی باہر آئی۔

"کیا قیامت آ گئی ہے۔ یہ محلے والے چین سے سونے بھی نہیں دیتے۔"

سلیم احمد نے کہا۔ "ماں جی ہم محلے والے نہیں ہیں۔ کراچی سے بابو لوہار کا پتہ پوچھنے آئے ہیں۔"

"بابو لوہار؟" بڑھیا نے کہا۔ "ارے آدھی رات کو کتنے پرانے مردے اکھاڑنے آئے ہو۔ اسے تو یہاں سے گئے تین سال ہو گئے ہیں۔"

"وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"لاہور گئے ہیں۔ کہتے تھے جا کر خط لکھیں گے۔ مگر آنکھ سے دور تو دل سے دور۔ کون کسی کو خط لکھتا ہے۔ آج کل پوسٹ کارڈ بھی مہنگا ہو گیا ہے۔"

سلیم احمد نے پوچھا۔ "کیا ان کے ساتھ سلمٰی بھی گئی ہے؟"

"کون سلمٰی؟"

"وہی جس کی بیٹی کا نام شبراتن تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی بابو لوہار کے ہاں رہتی تھیں۔"

"ارے ہاں سلمٰی۔ یاد آیا۔ بے چاری بڑی مصیبت زدہ تھی۔ بیٹی کی شادی کرنے کے دو مہینے بعد مر گئی۔"

"اوہ!" نواز صاحب کے دل میں ایک چوٹ سی لگی۔ ماں کا پتہ ملا مگر اس کا دیدار نصیب نہ ہوا۔

انہوں نے پوچھا۔ "شبو کی شادی کہاں ہوئی ہے؟"

"کون شبو؟"

سلیم احمد نے جلدی سے کہا۔ "وہی شبراتن۔ سلمٰی کی بیٹی شبراتن کہاں بیاہ کر گئی ہے؟"

"کراچی گئی ہے۔ کوئی بہت بڑا آدمی تھا۔ ذرا بوڑھا تھا۔ مگر پیسے والا تھا۔ بڑھاپے کو کون دیکھتا ہے۔ یہی بہت ہے کہ لڑکی عیش و آرام سے رہتی ہو گی۔"

"کیا آپ شبراتن کے سسرال کا پتہ جانتی ہیں؟"

"ارے میں عورت ہوں لیٹر بکس نہیں ہوں کہ میرے پیٹ میں سب کا پتہ لکھا ہو گا۔ کیوں میری نیند خراب کر رہے ہو' آخر تم لوگ کون ہو؟ کیوں اس کا پتہ پوچھ رہے ہو؟"

سلیم احمد نے کہا۔ "میں شبراتن کا باپ ہوں۔"

"کیا؟" بڑھیا نے حیرت سے پوچھا۔ "تو شبراتن کا باپ ہے؟"

"جی ہاں!"

"کیا تو سلمٰی کا خاوند ہے؟"

"جی ہاں!"

"ارے تیرے منہ پر جھاڑو پھرے' تجھ پر ہزار لعنت.... شرابی' جواری....

بدمعاش۔ اتنی وفادار عورت کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ چل نکل یہاں سے ' تھو ہے تجھ پر۔ اتنے برس بعد آدھی رات کو ایسے پوچھنے آیا ہے جیسے بیوی کے نام سے لاٹری نکل آئی ہو۔ جا یہاں سے اپنا منہ کالا کر۔"

اس نے کہا اور ایک دھڑاکے سے دروازے کو بند کر دیا۔

نواز صاحب نے گھور کر سلیم احمد کو دیکھا۔ وہ ندامت سے سر جھکا کر کار کی طرف جانے لگا۔

واپسی پر دونوں خاموش تھے۔

نواز صاحب اپنی والدہ کی موت پر افسوس کر رہے تھے لیکن دل کو ایک گونہ اطمینان بھی تھا کہ جوان بہن دربدر کی نہیں ہوئی۔ عزت آبرو سے بیاہ دی گئی ہے۔ البتہ اپنے والد کی طرف سے دل میں نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے تو انہوں نے سوچا کہ اپنے والد کی رہائش کا کسی دوسری جگہ انتظام کر کے انہیں اپنی نظروں سے دور کر دیں لیکن پھر انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ کیونکہ وہ ایک بار اپنی بہن کو دیکھنا چاہتے تھے اور سلیم احمد کے بغیر اسے پہچان نہیں سکتے تھے۔

ایک بہن کی خاطر وہ باپ کی غلطیوں کو معاف کرنے پر مجبور تھے۔

رشتے داروں سے دور بھاگنے والا شخص رشتوں کی زنجیروں میں جکڑ گیا تھا۔ آج تک انہوں نے کسی غلط آدمی کو برداشت نہیں کیا تھا لیکن اب انہیں معلوم ہوا تھا کہ خون کے رشتوں کی غلطیاں کس طرح نظرانداز کرنا پڑتی ہیں۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

☆==========☆==========☆

محبت کا دستور ہے کہ پہلے خاموش اشاروں سے اور خاموش اداؤں سے پیار کی ابجد پڑھی جاتی ہے۔ زبان کی گرہیں بعد میں کھلتی ہیں۔

دوسری صبح نواز صاحب دفتر آئے تو ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تمام رات جاگتے رہے ہیں۔ عزت اپنے کمرے میں تنہا تھی اور کسی مسودے پر جھکی ہوئی سر کھپا رہی تھی۔ فرزانہ فہیم ابھی نہیں آئی تھی۔ ناصرہ کسی معروف خاتون کا انٹرویو لینے گئی تھی۔

نواز صاحب نے پوچھا۔ "کیا لکھ رہی ہیں؟"

"اگلے شمارے کے لیے ایک نئی کہانی ہے۔"

"مکمل ہو گئی۔"

"جی نہیں۔ ایک عجیب سچویشن آ گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہانی کو کس طرح آگے بڑھاؤں۔"

آگے بڑھنے کا کوئی نہ کوئی راستہ مل ہی جاتا ہے۔ نواز صاحب کو بھی کچھ دیر وہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ عزت آراء کی میز کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

"ذرا مجھے بتایئے کہ سچویشن کیا ہے۔ پہلے کہانی کی آؤٹ لائن سنا دیجئے۔"

عزت نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ "ایک ملازمت کرنے والی لڑکی کی کہانی ہے۔ وہ ایک ہوٹل کی کاؤنٹر گرل ہے۔ اس ہوٹل میں بڑے بڑے رئیس آکر قیام کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک رئیس زادے کو اس لڑکی سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ رئیس زادہ اسے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ بھی مسکراتی ہے۔ لڑکے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی مسکراہٹ میں کہاں تک سچائی ہے۔ کیونکہ کاؤنٹر گرل ہر روز' ہر لمحہ' ہر مسافر کے لیے مسکراتی ہے۔ عورت کی مسکراہٹ جو خاص رشتوں اور خاص جذبوں کے لیے ہوتی ہے' اسے ہوٹل کے مالک نے ماہانہ چھ سو روپے کے عوض خرید کر اپنے گاہکوں کے لیے عام کر دیا تھا۔

"ملازمت کرنے کے دوران سب سے پہلے عورت کی مسکراہٹ زخمی ہوتی ہے۔

"رئیس زادہ مختلف بہانوں سے بار بار کاؤنٹر پر آنے لگا۔ ایک بار اس نے چائے کی دعوت دی۔ لڑکی نے دعوت قبول کر لی۔ اس نے دس بار دعوتیں دیں۔ اس نے ہر بار قبول کیا لیکن رئیس زادے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس لڑکی کے دل میں اس کے لیے سوفٹ کارنر ہے یا نہیں؟

"یہ خیال عام ہوتا ہے کہ ہوٹل میں کام کرنے والی لڑکیاں ہر مسافر کی دعوت قبول کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ چائے پیتی ہیں' ڈنر کرتی ہیں تاکہ ہوٹل کی سیل میں اضافہ ہو اور اس سیل کے حساب سے ہوٹل کا مالک انہیں کمیشن دیتا رہے۔

"لڑکی کے دل میں ایسا کوئی لالچ نہیں تھا لیکن وہ کیا کرتی؟ زبان سے محبت کا اقرار اس لئے نہیں کیا تھا کہ رئیس زادے نے کبھی کھل کر اقرار نہیں کیا تھا اور یہ تو محبت کا دستور ہے۔ پہلے خاموش اشاروں اور خاموش اداؤں سے پیار کی ابجد پڑھی جاتی ہے۔ زبان کی گرہیں بہت بعد میں کھلتی ہیں۔ اس لڑکی کی جھولی میں جتنے اشارے تھے اور جتنی ادائیں تھیں ان سب کو ملازمت کے بے حس لمحے چاٹ گئے تھے۔

"اب کہانی اس موڑ پر آکر رک گئی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی دلی کیفیات سے بے خبر ہیں۔ رئیس زادے نے اسے ڈنر کے لیے مدعو کیا ہے اور سوچ رہا ہے کہ کس انداز سے بات چھیڑی جائے۔ کھل کر یہ کہہ دینا کہ مجھے تم سے محبت ہے' ایک سستا اور عامیانہ انداز ہے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ذوق اور معیار کے مطابق محبت کا اظہار ہونا چاہئے۔ میں کہانیاں لکھتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھتی ہوں کہ اظہار محبت کے دوران ایسی دلچسپی اور ایسا تجسّس پیدا ہو کہ پڑھنے والوں کے دل دھڑکنے لگیں۔"

نواز صاحب تھوڑی دیر سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "کہانی میں پیار کی جستجو صرف رئیس زادے کو ہے۔ ہر بار اس کی طرف سے پہل ہوتی ہے۔ ایک آدھ بار لڑکی کی طرف سے حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے عزت کو دیکھا۔ عزت نے مسودے پر نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "اس کہانی کا ماحول مغربی طرز کا ہے مگر کردار مشرقی ہیں اور ایک مشرقی لڑکی خواہ کسی ماحول میں رہے وہ لجائیت کے خول سے باہر نہیں نکلتی۔ اس کی طرف سے حوصلہ

افزائی کی توقع کرنا فضول ہے۔"

نواز صاحب گہری سانس لے کر پھر سوچ میں ڈوب گئے۔

وہ دونوں ہاتھوں کی کہنیاں میز پر ٹیک کر ذرا آگے کو جھک گئے تھے اور اپنے ہاتھ کی ایک انگوٹھی سے کھیل رہے تھے۔ کبھی اس انگوٹھی کو انگلی سے نکالتے تھے اور کبھی پھر اسے پہن لیتے تھے۔

پھر انہوں نے عزت کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "رئیس زادے نے اسے ڈنر پر مدعو کیا ہے؟"

"جی ہاں!" عزت نے جواب دیا۔

"سچویشن کو ایک انگوٹھی کے ذریعے پلٹے کرائیے۔" وہ اپنی انگوٹھی سے کھیلنے لگے۔

عزت نے انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیسے؟"

"کچھ اس طرح کہ رئیس زادہ اس لڑکی کو اپنے دوست کا ایک واقعہ سناتا ہے۔

"ایک بار اس کے دوست نے اپنی محبوبہ کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ وہ بے حد شرمیلی تھی جواباً محبت کا اظہار نہ کر سکی۔ دوست نے اپنی انگلی سے انگوٹھی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ زبان بھی نہ ہلے اور اقرار بھی ہو جائے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے۔ میں یہاں سے جاتا ہوں تم اچھی طرح فیصلہ کرنے کے بعد اسے پہن لو یا پھینک دو۔ صبح ناشتہ کی میز پر میں تمہارے ہاتھوں کو دیکھوں گا اور تمہارے خاموش فیصلے کو سمجھ لوں گا۔

"رئیس زادہ یہ واقعہ سنا کر اپنی انگوٹھی لڑکی کے سامنے رکھ دے گا اور وہاں سے چلا جائے گا۔"

عزت نے خوش ہو کر کہا۔ "بہت عمدہ آئیڈیا ہے۔ لڑکی اس انگوٹھی کو دیکھ کر الجھن میں پڑ جائے گی کہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔"

نواز صاحب نے کہا۔ "ہاں۔ دوسری طرف رئیس زادہ بے چین اور مضطرب ہو گا۔ صبح کے انتظار میں تمام رات سو نہیں سکے گا۔"

عزت نے جواب دیا۔ "لڑکی بھی ساری رات کروٹیں بدلتی رہے گی۔ کبھی اس انگوٹھی کو ہاتھ میں لے کر دیکھے گی۔ کبھی بستر سے اٹھ کر بیٹھ جائے گی اور کبھی اٹھ کر بے

چینی سے ٹہلنے لگے گی۔"

نواز صاحب نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "پھر صبح ناشتہ کی میز پر ملاقات ہو گی۔"

"ہاں دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھیں گے۔"

"ہاں۔ مقابل بیٹھیں گے لیکن ان کے درمیان ایک بڑی سی میز ہو گی۔ لڑکی میز کے نیچے اپنا ہاتھ چھپانے کی کوشش کرے گی لیکن رئیس زادہ اس کی انگلی میں اپنی جگمگاتی اور مسکراتی ہوئی انگوٹھی دیکھ لے گا۔"

عزت ان کی خوشی کو سنجیدگی سے دیکھتی رہی۔ پھر ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "مم.... مگر وہ لڑکی انگوٹھی نہیں پہنے گی۔"

نواز صاحب کی خوشی یک لخت ہوا ہو گئی۔ "کیا مطلب' کیا وہ رئیس زادے کو پسند نہیں کرتی ہے؟"

"کرتی ہے!"

انہوں نے میز پر گھونسہ مار کر پوچھا۔ "پھر وہ انکار کیوں کرتی ہے؟ انگوٹھی قبول کیوں نہیں کرتی؟"

عزت نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ "اس لئے کہ اس لڑکی نے ہوٹل کے مالک سے بیس سال کا ایگری منٹ کیا ہے کہ وہ کنواری رہے گی۔"

"یہ کیسا ایگری منٹ ہے۔ میں نے کبھی ایسے ایگری منٹ کے متعلق نہیں سنا۔ یہ فضول سی بات ہے۔"

عزت نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یہ فضول سی بات نہیں ہے۔ میں نے ایسی عورتوں کو دیکھا ہے جو چالیس برس اور پچاس برس کی عمر تک کنواری رہ چکی تھیں۔ کسی عورت نے کہا کہ وہ بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے ملازمت کرتی رہی۔ کسی نے چھوٹی بہنوں کو سہاگن بنانے کے لیے اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا۔

"ایک عورت اپنے اندھے باپ کی آنکھوں کا علاج کرانے کے لیے پیسے جمع کرتی رہی۔ جب پیسے جمع ہو گئے تو پتہ چلا کہ آنکھیں اس وقت تک بیکار ہو گئی ہیں۔ بینائی واپس نہیں آ سکتی۔ اب اس نے آئی بینک میں درخواست دی ہے۔ کسی ہمدرد سے آنکھوں کا عطیہ مل گیا تو اس کے باپ کی بینائی واپس آ جائے گی۔ کب آئے گی؟ یہ نہیں

معلوم۔ وہ پانچ سال سے انتظار کر رہی ہے۔

"یہ عورتیں جو ملازمت کرنے کے لیے گھر سے نکلتی ہیں تو اس لئے نہیں نکلتیں کہ انہیں اپنے سنگھار کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نہیں کہتی کہ ایسی عورتیں نہیں ہوتیں۔ ایسی خود غرض عورتیں بھی موجود ہوتی ہیں جو چلتا پھرتا اشتہار بن کر شریف عورتوں کو بدنام کرتی ہیں۔ میں جن کے متعلق کہہ رہی ہوں' آپ انہیں بھی جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایسی عورتیں اپنے رشتوں اور اپنی محبتوں کے لیے ساری زندگی کا معاہدہ کرتی ہیں اور اپنی جوانی کو ملازمت کی بھٹی میں جھونک کر بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ جاتی ہیں۔

"میری کہانی میں جو لڑکی ہے وہ بھی کبھی مجبور تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن دو دو وقت کے فاقے کرتے تھے۔ گھر میں کوئی کمانے والا نہ تھا۔ ہوٹل کے مالک کو وہ خوبصورت لڑکی پسند آ گئی۔ اسے کاؤنٹر گرل کے لیے ایک ایسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی۔ جس کی مسکراہٹ کنواری ہو اور جس کے چہرے پر ہمیشہ کنوارے پن کی تازگی ہو اور جسے دیکھ کر مسافر دوسرے ہوٹلوں کا راستہ بھول جائیں۔

"ہوٹل کا مالک اگر اس سے بیس سال کا [illegible] نہ کرتا۔ تب بھی وہ رئیس زادے سے شادی نہ کرتی۔ اپنے بھائی بہنوں کو اپنے سسرال والوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑتی۔ کوئی عورت نہیں کہہ سکتی کہ شادی کے بعد خاوند کا رویہ [illegible] اور سسرال والے اس کے بھائی بہنوں تک اسے پہنچنے بھی دیں گے یا نہیں۔...

"ایک ملازمت کرنے والی لڑکی اپنے مستقبل سے زیادہ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کے مستقبل کے متعلق سوچتی ہے اور ان کی خوشیوں کے مطابق فیصلے کرتی ہے۔

"اس لڑکی نے بھی یہی فیصلہ کیا اور اسی لئے اس نے انگوٹھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"ہر انسانی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایک بہترین موقع آتا ہے۔ ایک لڑکی اس بہترین موقعہ کو ٹھکرا کر کس طرح جیتے جی مرتی ہے اور کس طرح مر مر کر زندہ رہتی ہے۔ یہ اسکینڈل تراشنے والے لوگ نہیں جانتے۔"

نواز صاحب کا دل ڈوبنے لگا۔

انہیں محسوس ہوا کہ اس لڑکی کی کہانی میں عزت آراء کی اپنی کہانی بھی چھپی ہوئی ہے۔ چھپنے کو تو اب تک بہت سی باتیں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ملازمت کرنے والی خواتین کے مسائل اس قدر توجہ طلب ہو سکتے ہیں۔

کیا عزت آراء بھی ایسے ہی کسی اہم مسئلہ سے الجھی ہوئی ہے؟

یہ سوال نواب صاحب کے ذہن میں چبھ رہا تھا۔

ان کی معلومات کے مطابق عزت کی صرف ایک بوڑھی والدہ اور ایک بھائی تھا۔ ان کے علاوہ کسی رشتہ دار کا بوجھ اس کے سر پر نہیں تھا یعنی وہ اپنی کہانی کی ہیروئن کی طرح مجبور نہیں تھی اور اپنے مستقبل کا فیصلہ اپنی مرضی سے کر سکتی تھی۔

انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ "کہانی کا انجام المناک نہیں ہونا چاہئے۔ پڑھنے والے اپنے ذہن پر ایک بوجھ سا محسوس کرتے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو اس کہانی میں تھوڑی سی ترمیم کر سکتی ہیں۔ اس لڑکی کو انگوٹھی قبول کرنے پر مجبور کر سکتی ہیں۔"

"مم.... مگر...." عزت نے کچھ کہنا چاہا۔ انہوں نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔

"مگر وگر کچھ نہیں۔ آپ بحث کرنے سے پہلے میرے مشورے پر غور کر لیجئے۔ اور کل مجھے اس کا انجام سنا دیجئے۔"

"کل.... مگر کل تو سنڈے ہے۔ آفس بند رہے گا۔"

نواز صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور وہاں سے جاتے ہوئے بولے۔ "کل صبح دس بجے آفس کھلا رہے گا۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

وہ دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ پھر وہاں سے پلٹ کر بولے۔ "وہ انگوٹھی لڑکی تک پہنچ گئی ہے۔ اس لڑکی کو سمجھائیے کہ زندگی کے اس بہترین موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔"

یہ کہہ کر وہ دفتر سے باہر چلے گئے تھے۔

وہ تھوڑی دیر تک بند دروازے کو دیکھتی رہی۔ ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر مسودے کی طرف توجہ دینے کے لیے میز پر جھک گئی۔

میز پر وہ سونے کی انگوٹھی مسکرا رہی تھی۔

وہ چونک کر کرسی پر سیدھی ہو گئی اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ انگوٹھی تو نواز صاحب نے پہنی ہوئی تھی۔

انہوں نے کہا تھا کہ وہ رئیس زادہ ڈائننگ ٹیبل پر اس لڑکی کے سامنے انگوٹھی چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

اور نواز صاحب خود ہی اس کے سامنے میز پر اپنی انگوٹھی چھوڑ کر چلے گئے۔

عزت کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

رئیس زادہ دوسری صبح اس لڑکی کو ناشتے کی میز پر بلاتا ہے اور نواز صاحب نے دوسری صبح اسے دفتر میں بلایا تھا اور بڑے ہی پرامید لہجے میں کہا تھا کہ میں آپ کا انتظار کروں گا۔

عزت کی آنکھوں میں خوابوں کا خمار جاگنے لگا۔

انہوں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کو سمجھائیے۔ زندگی کے اس بہترین موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

بہترین موقع!

عزت کا دل انگوٹھی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

بہترین موقع!

اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ لرزتے ہوئے اور کانپتے ہوئے اس انگوٹھی تک پہنچ گئے۔

اس کی انگلیوں نے اسے چھو لیا۔

وہ طلسمی انگوٹھی تھی۔ اس انگوٹھی کو پہن کر نواز صاحب کے دل کی رانی اور ایک شاندار کوٹھی کی مالکہ بن سکتی تھی۔ نانی جان اور دادی جان نے جو خواب دکھائے تھے' ان کی تعبیر آج وہ دیکھ سکتی تھی۔

بس.... وہ جادوئی انگوٹھی پہننے کی دیر تھی۔

☆============☆============☆

میں کہانیاں لکھتی ہوں۔ اس دنیا کے کرداروں کو مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ آپ زندگی کے جس موڑ سے گزر رہے ہیں اس موڑ پر بڑی بڑی سبق آموز کہانیاں تخلیق ہوتی ہیں۔

عزت دور کھڑی ہوئی اپنے بستر کو دیکھ رہی تھی۔ اس بستر پر وہ روز ہی سویا کرتی تھی۔ جو روزانہ کے استعمال کی چیز ہو۔ اسے کوئی توجہ سے نہیں دیکھتا کیونکہ وہ چیز کثرت استعمال سے پرانی اور بیزار کن ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنے بستر کو دیکھے جا رہی تھی۔

ویسے ایک بات ہے۔ کنواری لڑکیوں کا بستر کبھی پرانا اور بیزار کن نہیں ہوتا۔ وہ ہر رات اس پرانے بستر پر سوتی ہیں اور نئے نئے خواب دیکھتی ہیں۔ بستر کی اہمیت نہیں ہوتی' خوابوں کی اہمیت ہوتی ہے۔

مگر بعض اوقات خوابوں سے پہلے بستر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

اس بستر پر تکیے کے اوپر نواز صاحب کی انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔

وہ انگوٹھی ایک پھول تھی اور اس بستر کو پھولوں کی سیج بنا رہی تھی۔

وہ انگوٹھی نہیں تھی۔ نواز صاحب تھے اور اس کے خوابوں کی تعبیر کے لیے اسے اپنے قریب بلا رہے تھے۔

وہ شرماتی لجاتی ہوئی اس طرح بستر پر آگئی جیسے دلہن سہاگ کی سیج پر آئی ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ تکیہ پر جھکی اور اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے انگوٹھی کی مسکراہٹ پر اپنے سلگتے ہوئے رخسار کو رکھ دیا۔

اس کے رخسار نواز صاحب کے سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ان کے دل کی دھڑکنیں بھی سن رہی تھی۔ وہ پیار بھری سرگوشی میں کہہ رہے تھے۔

عزت.... میری عزت!

میں نے یہ انگوٹھی جان بوجھ کر تمہارے سامنے چھوڑ دی تھی۔

میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم محبت کے اس تحفہ کو قبول کرتی ہو یا نہیں۔

تم نے قبول کر کے اس انگوٹھی کی عزت بڑھا دی ہے۔

عزت آنکھیں بند کیے تکیہ پر اس طرح اپنی ہتھیلی پھیرنے لگی جیسے نواز صاحب کے چوڑے چکلے سینے کو سہلا رہی ہو۔ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں کیسے قبول نہ کرتی۔ یہ انگوٹھی آپ کی محبت کا پہلا اظہار ہے۔ یہ انگوٹھی ایک کنجی ہے۔ اس کنجی سے میں اپنے مستقبل کے دروازے کھول سکتی ہوں اور سہاگن بن کر ان دروازوں سے گزر سکتی ہوں۔"

دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ اس انگوٹھی کو اپنی انگلی میں سجا لو۔"

اس نے آنکھیں کھول دیں اور شرماتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی اسے دیکھنے لگی۔

صبح کو یہ نواز صاحب کی انگلی میں تھی اور اب اس کی انگلی میں آنا چاہتی تھی۔

اس نے چٹکی سے اسے اٹھا کر ہتھیلی پر رکھ لیا۔

اسے اب انگلی میں پہن لینا چاہئے تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔

اسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ انگوٹھی اس کی اپنی ہوتے ہوئے بھی پرائی ہے۔

شاید وہ انگوٹھی بھول سے اس کے پاس چلی آئی ہے۔

نواز صاحب گفتگو کے دوران اسے بھول کر چلے گئے ہیں۔ جیسے ایک بار وہ اپنا قلم میز پر بھول کر چلے گئے تھے۔ جیسے ایک بار وہ دفتر سے نکلتے وقت اپنی کار کی چابی بھول کر چلے گئے تھے۔ اسی طرح شاید اپنے دوست کی کہانی سناتے سناتے وہ انگوٹھی بھول کر چلے گئے ہیں۔

عزت کے مسکراتے ہوئے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

یہ عجیب محبت تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے دلچسپی رکھتے تھے مگر اپنی چاہت کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ عزت اس لئے جھجکتی تھی کہ نواز صاحب اس کی حیثیت سے بہت اونچے تھے۔

زمین پر کھڑا ہو کر آسمان کو چھونے والا احمق کہلاتا ہے۔ اگر وہ نواز صاحب کو چھونے کی پہل کرتی تو وہ اسے احمق کہہ سکتے تھے۔

دوسری جانب نواز صاحب بھی ذرا محتاط تھے۔ ان میں کچھ جھجک تھی اور کچھ اپنے مرتبے کا خیال تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنی محبت کا اظہار کیا اور عزت نے

انکار کر دیا تو یہ توہین برداشت نہیں کر سکیں گے۔

پھر یہ کہ عزت نے کہانی پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا کہ محبت کے اظہار کے لیے ستا اور عامیانہ انداز نہیں ہونا چاہئے بلکہ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ذوق اور معیار کے مطابق کوئی پیارا سا انداز اختیار کرنا چاہئے۔

یہ بات عزت نے کہانی کے کرداروں کے لیے کہی تھی لیکن سمجھنے والوں کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کے اشاراتی انداز کو سمجھتے ہوئے کچھ زیادہ ہی معیاری راستہ اختیار کر رہے تھے اور اس کا نتیجہ بھگت رہے تھے۔

بہ حال عزت فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ جان بوجھ کر انگوٹھی اس کے لیے چھوڑ گئے ہیں یا بھول کر چلے گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے کل صبح دفتر آنے کے لیے کہا ہے۔ دفتر میں اتوار کو ملنا' تنہائی میں ملنا' انگوٹھی کی کہانی سنا کر انگوٹھی بھول جانا۔ یہ سب اشارے سمجھ میں آتے تھے لیکن یہ اشارے کسی آخری فیصلہ تک نہیں پہنچاتے تھے۔

ایسے حالات کب تک رہیں گے۔ امید اور ناامیدی کے درمیان سانس لینے سے سکون نہیں ملتا۔ وہ اپنے نصیبوں سے ساتھی بن سکیں گے یا نہیں' یہ بعد کی بات ہے لیکن پہلے ان کی محبت کا یقین تو ہو جانا چاہئے۔

دروازے پر آہٹ سن کر اس نے جلدی سے مٹھی بند کر لی۔ محبت کی بھٹکی ہوئی انگوٹھی کو اپنی مٹھی میں چھپا لیا اور پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

دروازے پر فرہاد کھڑا ہوا تھا۔

وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ "تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"جی.... جی ہاں۔ نیند نہیں آ رہی۔"

"مجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ دل میں کوئی بات اٹک کر رہ جائے اور زبان پر نہ آ سکے تو نیند نہیں آتی۔"

عزت چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ فرہاد اس کے دل کی ترجمانی کر رہا تھا۔

وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ "مم.... میں سمجھی نہیں۔ ایسی کون سی بات ہے جو زبان پر نہیں آ سکتی؟"

"بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہیں کہی جا سکتیں۔"

وہ اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"آج میں نے سوچا تھا کہ امی سے بات کروں گا مگر ہمت نہ ہوئی۔ تم میری چھوٹی بہن ہو۔ تم ہی میری طرف سے انہیں سمجھا دو۔"

عزت نے ایک گہری سانس لی۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ فرہاد اس کے دل کی ترجمانی نہیں کر رہا ہے بلکہ اپنے دل کی بات کہہ رہا ہے۔

"بھائی جان! وہ کون سی بات ہے کہ آپ امی سے نہیں کہہ سکتے؟"

"اپنی شادی کی بات ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

عزت نے خوش ہو کر اس کے بازو کو تھام لیا اور پیار سے جھنجوڑتی ہوئی بولی۔

"ہائے اللہ! اتنی خوشی کی بات ہے اور آپ ٹھنڈی سانس لے کر کہہ رہے ہیں۔"

"وہ اس لئے عزت کہ اس خوشی کے ساتھ ناکامی کا بھی خدشہ ہے اور وہ خدشہ امی کی طرف سے ہے۔ سوچتا ہوں کہیں وہ انکار نہ کر دیں۔"

"ارے واہ! وہ کیوں انکار کریں گی۔ وہ تو خوشی سے پاگل ہو جائیں گی۔"

اس نے مایوسی سے کہا۔ "نہیں عزت' امی کو وہ لڑکی پسند نہیں آئے گی۔"

وہ پورے یقین سے بولی۔ "آئے گی.... اور ضرور پسند آئے گی۔ مجھے تو شبنم بھابھی بہت اچھی لگتی ہے۔"

"کیا؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ "تت.... تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں.... میں شبنم سے.... میرا مطلب ہے کہ میں اسے پسند کر چکا ہوں؟"

وہ ہنسنے لگی۔ "بھئی جان! میں کہانیاں لکھتی ہوں۔ اس دنیا کے کرداروں کو مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ آپ زندگی کے جس موڑ سے گزر رہے ہیں' اس موڑ پر بڑی بڑی سبق آموز کہانیاں تخلیق ہوتی ہیں۔"

"یہ تو آپ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ آپ جو کاروبار کر رہے ہیں اس میں شبنم کا پیسہ ہے اور آپ کی محنت ہے۔ مجھے شبنم کے کردار کی یہ خوبی پسند تھی کہ وہ اپنے سینے میں ایک درد مند دل رکھتی ہے اور دوسروں کے کام کرتی ہے لیکن آپ کی طرف سے اندیشہ تھا کہ اس کی بدنامیوں کی وجہ سے آپ زیادہ عرصہ تک اس کے ساتھ کاروبار میں شریک نہیں رہیں گے۔

"بھائی جان! شبنم کا ماضی کیا ہے' یہ میں نہیں جاننا چاہتی۔ ایک مصنفہ کے ذہن سے میں نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی موجودہ زندگی ایک پاکیزہ عورت کی زندگی ہے۔ اگر آج بھی اس میں کھوٹ ہوتا تو آپ اسے کبھی قبول نہیں کرتے۔"

فرہاد بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ "تم کتنی اچھی بہن ہو' کتنا اچھا ذہن ہے تمہارا! کاش کہ ساری دنیا اس نہج پر سوچتی اور اس کے ماضی کو بھول جاتی۔"

"نہیں بھائی جان! دنیا اس کے ماضی کو نہیں بھولے گی۔ ہم اور آپ بھول سکتے ہیں۔ میں نے ابھی کہا ہے نا کہ آپ شبنم کے ساتھ زندگی کے جس موڑ سے گزر رہے ہیں اس موڑ پر بڑی بڑی سبق آموز کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ ہم اس کہانی کو پورے خلوص اور ایمان سے مکمل کریں گے۔ شبنم اس گھر کی عزت بن کر ضرور آئے گی۔"

"عزت! تم میرا حوصلہ بڑھا رہی ہو مگر پھر وہی بات آڑے آتی ہے کہ مور خوشی میں ناچتے ناچتے [illegible] پاؤں دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہے۔ تم ہی بتاؤ نا! امی کو جب یہ معلوم ہو گا تو وہ [illegible] فیصلہ [illegible] کریں گی۔"

"وہ راضی [illegible] جائیں گی۔"

"وہ راضی نہیں ہوں گی۔"

"میں [illegible] جائیں گی۔"

"میں [illegible] نہیں [illegible] گی۔"

دوسرے کمرے سے انہیں اپنی والدہ کی آواز سنائی دی۔ "کیا آدھی رات کو شور مچا رہے ہو' چپ چاپ سو جاؤ۔ مجھے [illegible] پسند ہے۔"

دونوں ایک ساعت کے لیے سکتہ کی حالت میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اچانک وہ دوڑتے ہوئے اپنے کمرے سے نکلے اور دوسرے کمرے میں آئے اور والدہ کے بستر پر گر کر ان سے لپٹ گئے۔

ان سے لپٹنے کے دوران عزت کی مٹھی کھل گئی اور انگوٹھی والدہ کی گود میں گر گئی۔ ایک بھابھی آنے کی خوشی ایسی تھی کہ وہ وقتی طور پر وہ بھول گئی کہ اس کی مٹھی میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی لیکن اب وہ اپنی خوشی بھول گئی اور پریشان ہو کر اسے تلاش کرنے لگی۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ صرف اتنی سی روشنی تھی جو دوسرے کمرے کی لائٹ سے

بسر ہو رہی تھی۔ فرہاد اپنی والدہ کی خوشامدیں کر رہا تھا اور ان کی تعریفیں کئے جا رہا تھا۔ عزت اپنے پاس بستر کو ہاتھ سے ٹٹول کر انگوٹھی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کی والدہ نے کہا۔ "بیٹا! تمہیں شبنم اتنی پسند آئی کہ ماں سے پوچھے بغیر منگنی کا سامان کر لیا۔"

"نہیں امی! آپ سے پوچھے بغیر میں منگنی کی تیاری کیسے کر سکتا ہوں؟"

"جھوٹا کہیں کا' دیکھ! دلہن کے لیے انگوٹھی لے کر آیا ہے اور مجھ سے چھپاتا ہے۔"

عزت کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

وہ کبھی ماں کو دیکھ رہی تھی جس کے ہونٹوں پر اپنی بہو کے لیے مسکراہٹ تھی اور کبھی بھائی کو دیکھ رہی تھی جو حیرانی سے انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔

وہ کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔

وہ کیسے کہے کہ انگوٹھی اس کی ہے' اسے نواز صاحب نے تحفہ دیا ہے۔

کیا وہ اسے قبول کر لیں گے۔ ایک غیرت مند بھائی اور ایک بوڑھی ماں کے دل پر کیا گزرے گی۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ اس نے ایک غیر مرد سے سونے کی انگوٹھی لی ہے۔

کیوں لی ہے؟

اگر نواز صاحب یہ انگوٹھی پہنانا چاہتے تھے تو انہیں دستور کے مطابق لڑکی کے گھر آنا چاہئے تھا۔

اور اگر عزت نے اسے قبول کیا ہے تو پہلے اسے اپنی والدہ کی رضامندی حاصل کرنی چاہئے تھی۔ جب بھائی نے اپنی والدہ کی رضامندی کے بغیر یہ فیصلہ نہیں کیا تھا تو بہن نے کیوں کر لیا؟

وہ ایک مجرمہ کی طرح گم صم ہو کر انگوٹھی کو دیکھتی ہی رہ گئی۔

فرہاد نے کہا۔ "یہ انگوٹھی میری نہیں ہے۔"

"ارے ہاں! میں جانتی ہوں تیری نہیں ہے۔ تیری دلہن کے لئے آئی ہے۔ میرے سامنے کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ اب لے ہی آیا ہے تو اسے رکھ لے۔ کل میں خود ہی جا کر

اپنی بہو کو پہناؤں گی۔"

فرہاد اچانک مسکرانے لگا۔ اس نے یہ سمجھا کہ اس کی والدہ نے کسی خیالی بہو کے لیے پہلے سے انگوٹھی بنوا رکھی تھی۔ دوسرے کمرے سے شبنم کی باتیں سن کر وہ اس انگوٹھی کو لے کر بیٹھ گئی تھیں تاکہ بیٹا خوشی سے پیار جتانے آئے تو اسے دلہن کے لیے یہ تحفہ دے دے۔

اس نے مسکرا کر انگوٹھی لیتے ہوئے کہا۔ "امی! آپ تسلیم نہیں کریں گی کہ انگوٹھی آپ لے کر آئی ہیں۔ چلئے میں ہی تسلیم کر لیتا ہوں۔ فرق کیا پڑتا ہے۔"

"شریر کہیں کا۔ اپنی ہی بات منوائے گا۔ اچھا جا' اب جا کر سو جا۔ کل میں منگنی کی رسم ادا کروں گی۔"

"کل نہیں امی' پرسوں۔۔۔"

"[illegible] نہیں؟"

"[illegible] نے شبنم کے لیے ایک نیا مکان کرائے پر لیا ہے۔ کل وہ نئے مکان میں منتقل ہوگی۔ اس [illegible] آپ اور عزت پرسوں چلیں گی تو وہ بہتر ہوگا۔"

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔ ہم پرسوں ہی جائیں گے۔"

عزت جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "بھائی جان! یہ انگوٹھی مجھے دیجئے میں رکھتی ہوں۔"

اس نے فوری طور پر فیصلہ کیا تھا کہ بھائی سے انگوٹھی لے لی۔ کل صبح نواز صاحب کو واپس کرے گی اور گھر میں کہہ دے گی کہ وہ کہیں گم ہو گئی ہے۔

فرہاد نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "لو' تم ہی رکھو!"

عزت نے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اس کی والدہ نے روک دیا۔

"نہیں بیٹا! عزت کو نہ دو۔ یہ کہانیاں لکھنے والی لڑکیوں کا دماغ ہمیشہ غیر حاضر رہتا ہے۔ اسی لئے تو میں اس سے کھانا نہیں پکواتی۔ کبھی سالن میں نمک نہیں ڈالتی ہے اور کبھی مرچیں زیادہ ڈال دیتی ہے۔ ہمارے گھر میں یہ پہلی خوشی ہے۔ اگر اس نے بے خیالی میں کہیں گم کر دی تو بدشگونی ہوگی۔ تم اسے اپنے ہی پاس رکھو۔"

فرہاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "عزت! امی نے یہ انگوٹھی اپنے پاس نہیں رکھی تو

تمہارے پاس کیا رہنے دیں گی۔ چلو میرے پاس ہی رہنے دو۔ ویسے وہاں جا کر تم ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی بھابھی کو انگوٹھی پہنانا۔"

یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

عزت کی عجیب حالت تھی۔

وہ انگوٹھی لے کر مصیبت میں پڑ گئی تھی۔ نہ نگل سکتی تھی' نہ اگل سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کل صبح نواز صاحب کو کیا جواب دے گی۔ اگر وہ انگوٹھی بھول کر گئے تھے تو اسے واپس کرنا تھا اور اگر قبول کرنے کے لیے دے گئے تھے تو اسے انگلی میں نظر آنا چاہئے تھا۔

وہ سر جھکا کر آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

کچھ لڑکیاں بری نہیں ہوتیں مگر بدنام ہوتی ہیں۔ اسی طرح بدنام ہوتی ہیں۔ دوسروں کی پھینکی ہوئی چیز یا بھولا ہوا تحفہ اٹھا کر لے آتی ہیں۔ اس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحفہ کے طور پر ان کے پاس آیا تھا۔ ایسے تحفہ سے کیا حاصل کہ والدین سے چھپایا جائے جیسے محبت نہیں کی ہو' چوری کی ہو یا پھر گناہ چھپایا جا رہا ہو۔

اس کی جی میں آیا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔

لیکن بھائی کی خوشی میں یہ رونے کا کون سا موقع تھا۔ فرہاد اسے روتے ہوئے دیکھ لے گا تو کیا سوچے گا؟

وہ پریشانی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی اور بار بار بھائی کے کمرے کی جانب دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے کمرے کی بتی بجھا دی تاکہ ماں یہی سمجھے کہ بیٹی سو گئی ہے۔ پھر وہ بھائی کے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکنے لگی۔

فرہاد بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس انگوٹھی کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اسے اپنی محبوبہ سے منسوب ہوتے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ انگوٹھی کتنی بلندی سے بہن کی ہتھیلی میں آئی تھی اور اب وہ اسے اندر ہی اندر رُلا رہی تھی۔

وہ کمرے کے اندر آ گئی۔

فرہاد جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور شرما کر انگوٹھی کو چھپانے لگا۔

عزت نے نظریں جھکا کر بھائی کے ہاتھ کی جانب دیکھا اور آہستگی سے کہا۔

"بھائی جان! میں.... آپ سے.... کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں' ہاں' کہو۔ آؤ یہاں بیٹھو۔"

وہ ذرا سا ہچکچائی پھر سوئچ بورڈ کی طرف جا کر اس نے لائٹ آف کر دی۔

اندھیرے میں فرہاد کی آواز ابھری۔ "یہ.... تم نے اندھیرا کیوں کر دیا؟"

"میں.... آپ سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کر سکتی۔ تھوڑی دیر کے لیے اندھیرا ہی رہنے دیجئے۔"

"وہ..... وہ جو انگوٹھی آپ کے پاس ہے.... وہ میری ہے۔"

"تمہاری ہے؟"

"نن.... نہیں.... میری نہیں ہے.... نواز صاحب کی ہے۔ وہ دفتر میں بھول کر چلے گئے تھے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

پھر فرہاد کی آواز ابھری۔ "عزت! اگر نواز صاحب اسے بھول کر چلے گئے ہیں اور تم نے اسے اٹھا لیا ہے تو اسے واپس بھی کر سکتی ہو۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے لیکن اس وقت بھائی کے سامنے جھوٹ بول کر جرم کر رہی ہو اور اندھیرے میں اپنا منہ چھپا رہی ہو۔"

"نہیں بھائی جان! میں آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ میرے اور نواز صاحب کے درمیان کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں آپ کو پوری بات بتاتی ہوں۔ آپ توجہ سے سنئے اور خود ہی میرے جھوٹ سچ کا فیصلہ کیجئے۔"

وہ آہستہ آہستہ' رک رک کر وہ واقعہ سنانے لگی کہ ایک کاؤنٹر گرل کی کہانی پر نواز صاحب سے کس طرح بحث ہوئی تھی' کس طرح انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ کہانی کے کردار کو ایسی سچویشن میں لایا جائے کہ وہ اپنی محبوبہ کے سامنے انگوٹھی چھوڑ کر چلا جائے تاکہ اس کی محبوبہ تنہائی میں اسے قبول کرنے کا فیصلہ کرے۔ انہوں نے کہانی کی بات کی تھی اور خود ہی اپنی انگوٹھی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

"بھائی جان! میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ میرے لئے انگوٹھی چھوڑ کر چلے گئے

ہیں یا بھول کر چلے گئے ہیں۔"

فرہاد کا نرم لہجہ سنائی دیا۔ "عزت! تم ذہین ہو۔ کہانیاں لکھتی ہو۔ کرداروں کی نفسیات کو سمجھتی ہو۔ کیا اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتیں کہ یہ انگوٹھی کس انداز میں تمہارے پاس آئی ہے۔"

وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ "ان کے رویئے اور گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر اسے میرے پاس چھوڑ گئے ہیں لیکن پھر سوچتی ہوں کہ انہیں بھولنے کی بھی عادت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے بھول گئے ہوں۔

"جو کچھ بھی ہے بھائی جان! یہ انگوٹھی جس انداز میں بھی آئی ہے۔ میں اسے واپس کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں عزت! اسے واپس ہونا چاہئے۔ یہ انگوٹھی تمہاری میز پر گری ہوئی تھی۔ تحفہ گرا کر نہیں دیا جاتا۔ ہاتھوں سے اٹھا کر دیا جاتا ہے۔ تم جاؤ' آرام کرو۔ کل کسی وقت میں نواز صاحب کے پاس جاؤں گا۔ اگر وہ بھول گئے ہیں تو انہیں واپس کر دوں گا۔ اگر وہ تمہیں اپنی عزت بنانا چاہتے ہیں تو میں ان سے کہوں گا کہ دستور کے مطابق ہمارے ہاں آ کر انگوٹھی پیش کریں۔ جاؤ' فکر نہ کرو۔ مجھے تمہاری خوشیاں عزیز ہیں۔"

وہ اندھیرے میں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

اسے یقین تھا کہ فرہاد جو کرے گا اس کی بہتری کے لیے کرے گا اور بہن کی خوشیوں کی خاطر نواز صاحب سے کبھی غلط رویہ اختیار نہیں کرے گا۔

وہ مطمئن ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

☆===========☆===========☆

ہوٹل کے پرسکون ماحول میں ہلکی ہلکی موسیقی ہو گی اور راز و نیاز کی ایسی باتیں ہوں گی کہ وہ بار بار شرما کر بل کھا جائے گی اور رہ رہ کر اپنا بدن چرائے گی۔ ہائے! وہ کتنا خوبصورت نظارہ ہو گا۔

نواز صاحب کو بھی دوسری صبح کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس لئے وہ سکون سے سو نہ سکے اور کروٹوں پر کروٹیں بدلتے رہے۔

اگر یہ سچ ہے کہ عزت دیر سے ملتی ہے تو پھر اس عزت کو اپنانے کا انتظار ٹھیک ہی تھا۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا انتظار تھا۔ انہوں نے اچھی طرح سوچا تھا' سمجھا تھا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا کہ ہماری سوسائٹی میں بیشتر لڑکیاں جھوٹے اسکینڈل کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔

ایک فنکار اپنی خوبصورت تخلیق سے پہچانا جاتا ہے۔ ماہنامہ "عزت" کی کتابت اور طباعت کا معیار' اس کی ظاہری اور باطنی خوبصورتی عزت آراء کی صلاحیتوں کی رہین منت تھی۔ اس رسالہ کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے پیچھے کام کرنے والی عورت کا ذہن کتنا خوبصورت ہو گا۔

اس باطنی خوبصورتی کو پہچاننے میں بہت سارا وقت گزر گیا تھا۔ اب نواز صاحب پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے عزت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اس کی خاموشی کو' اس کے تکلم کو' اس کے انکار کو اور اس کے اقرار کو۔ اور اب ان کے دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ کل صبح وہ مجسم اقرار بن کر دفتر میں ملنے آئے گی۔

اس کے ہاتھ کی کسی مخروطی انگلی میں ان کی پیش کی ہوئی انگوٹھی مسکراتی ہو گی۔

وہ خیال ہی خیال میں مسکراتے رہے۔

صبح آنکھ کھلی تو ساڑھے سات بج گئے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھے اور غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنی پسند کا بہترین لباس پہنا' بہترین خوشبو اپنے کپڑوں میں لگائی اور اپنی زندگی کی بہترین مسکراہٹ سے آئینہ میں دیکھ کر خود کو پسند کیا۔ کسی کی نظروں میں سمانے سے پہلے اپنی نظروں میں مکمل ہونا پڑتا ہے۔

اپنے آپ کو تیار کرنے میں بڑا وقت لگ گیا۔ نو بج رہے تھے اور دس بجے سے پہلے

دفتر پہنچنا تھا اور اس سے پہلے پریس جانا ضروری تھا۔ وہ ناشتہ کئے بغیر گھر سے نکل گئے۔

کار ڈرائیو کرتے ہوئے انہوں نے سوچا کہ وہ عزت کے ساتھ ناشتہ کریں گے۔ اس کے ساتھ کسی تفریح گاہ میں جائیں گے اور وہاں کے سب سے مہنگے ہوٹل میں بیٹھ کر اس سے میٹھی میٹھی سرگوشیاں کریں گے۔ ہوٹل کے پرسکون ماحول میں ہلکی ہلکی موسیقی ہوگی اور راز و نیاز کی ایسی باتیں ہوں گی کہ وہ بار بار شرما کر بل کھائے گی اور رہ رہ کر اپنا بدن چرائے گی۔ ہائے' وہ کتنا خوبصورت نظارہ ہوگا۔

وہ مدتوں کے بعد ایک حسین ساتھی کی اہمیت کو محسوس کر رہے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ ہمیشہ اس جان بہار کے تصور میں ڈوبے رہیں لیکن محبت کے ساتھ زندگی کے دوسرے مسائل بھی ہوتے ہیں۔ وہ آئندہ پرچہ شائع کرنے کے لیے برکت پرنٹنگ پریس سے معاملات طے کرنا چاہتے تھے۔ کاروباری معاملات طے کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ اس لئے وہ پریس کے مالک سے گفتگو کے لیے کوئی دوسرا وقت مقرر کرنا چاہتے تھے۔ آج کا دن عزت کے لیے مخصوص ہو چکا تھا۔

پریس کے سامنے انہوں نے کار روک دی۔

اتوار کا دن تھا۔ تمام دکانیں بند تھیں۔ لیکن فٹ پاتھ کی چھوٹی چھوٹی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہر روز کی طرح آج بھی گاہکوں کی بھیڑ تھی اور اچھی خاصی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ وہ کار سے اتر کر پریس کی دوسری منزل پر آئے۔ پریس کا مالک برکت علی بالکونی میں بیٹھا جاڑے کی دھوپ سے لطف اٹھا رہا تھا۔ نواز صاحب کو دیکھتے ہی اس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور ان کے لیے بالکونی میں ایک کرسی منگوائی۔

نواز صاحب نے کہا۔ "آج میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں کل کا کوئی وقت مقرر کر لیجئے۔"

برکت علی نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ کل ہی سہی۔ آپ کسی بھی وقت آ جائیے۔ میں یہاں موجود رہوں گا۔ لیکن آپ کو تھوڑی دیر تو بیٹھنا ہی ہوگا۔ میں آپ کو چائے پیئے بغیر نہیں جانے دوں گا۔"

"تکلف نہ کریں برکت صاحب! دس بجے میرا ایک ضروری اپوائنٹمنٹ ہے۔"

"دس بجے!" اس نے رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی سوا نو بجے ہیں۔ چائے

پینے میں زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ صرف ہوں گے۔ اے عبدل! جلدی سے چائے لاؤ۔"

نواز صاحب مجبور ہو کر بیٹھ گئے۔ برکت علی نے مسکرا کر پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے کوئی بہت ہی خوبصورت اپوائنٹمنٹ ہے۔"

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "عشق اور مشک کبھی نہیں چھپتے۔ دیکھئے نا! آج اتوار ہے کوئی کاروباری اپوائنٹمنٹ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہوا بھی تو آپ جیسا کاروباری انسان ایسی دل موہ لینے والی خوشبو لگا کر نہیں جائے گا۔"

نواز صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ خواہ مخواہ سراغرساں بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ سچ ہے۔ میں شادی کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔"

"وری گڈ! میری طرف سے پیشگی مبارکباد قبول کیجئے۔ کل ہی میں صفدر صاحب سے کہہ رہا تھا کہ نواز صاحب کو اب کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لینا چاہئے۔ بھئی دیکھئے نا! ابھی آپ شادی کریں گے تو ایک سال بعد ہونے والا بیٹا آپ کے بڑھاپے میں پہنچ کر جوان ہوگا۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "بہت خوب! آپ تو کسی بزرگ کی طرح میری شادی اور بچوں کا حساب کرنے بیٹھ گئے ہیں۔"

اتنے میں چائے آ گئی۔ وہ دونوں اپنی پیالیاں اٹھا کر چائے پیتے ہوئے نیچے فٹ پاتھ کی گہما گہمی کو دیکھنے لگے۔ اس بھیڑ میں شبنم اور فرہاد بھی تھے۔ وہ دونوں اپنے ہاتھوں میں شاپنگ کا ڈھیر سارا سامان اٹھائے اپنی کار کی طرف جا رہے تھے۔

نواز صاحب' شبنم سے واقف نہیں تھے لیکن فرہاد کو عزت کے بھائی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ وہ اپنی بہن سے ملنے کے لیے دو بار ان کے دفتر آ چکا تھا۔ عزت نے اپنے بھائی سے ان کا تعارف بھی کرایا تھا۔

اب وہ شبنم کو دیکھ رہے تھے۔ اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ لوگ اسے ایک بار ضرور دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ فرہاد اور شبنم ایک دوسرے کے ساتھ خوب جچ رہے تھے۔ بڑا ہی خوبصورت رومانی جوڑا تھا۔

برکت علی کے ہاتھوں میں چائے کی پیالی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ وہ غصہ سے دانت پیستے

ہوئے فرہاد کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی تک اس ذلت کو نہیں بھلا سکا تھا جب فرہاد نے شبنم کی کوٹھی سے مار کر اسے بھاگ جانے پر مجبور کیا تھا۔

اس نے شبنم کی جانب حقارت سے دیکھ کر کہا۔ "سالی رنڈی! اب نیا یار کر کے گھوم رہی ہے۔"

نواز صاحب نے چونک کر برکت کو دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کسے گالی دے رہے ہیں؟"

"وہی جو اسکائی بلیو کار کے پاس کھڑی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے یار نے بڑی تگڑی شاپنگ کرائی ہے۔ ڈھیر سامان کار میں لاد رہی ہے۔"

نواز صاحب کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ پھر شبنم اور فرہاد کی جانب دیکھنے لگے۔ یہ کیسی شرمناک بات تھی کہ وہ جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے' اس کا بھائی ایک بدنام عورت کے ساتھ سرعام گھومتا پھرتا نظر آ رہا تھا۔

بدنام عورت!

بدنام عورت!

نواز صاحب کو یکایک خیال آیا کہ بدنامیاں جھوٹی بھی ہوتی ہیں۔ اسکینڈل تراشنے والے لوگ اچھی خاصی شریف زادیوں کو بدنام کر دیتے ہیں۔

انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ "برکت صاحب! کسی عورت کو خواہ مخواہ گالی دے کر بدنام نہیں کرنا چاہئے۔ میں اس نوجوان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کسی غلط عورت کی سوسائٹی اختیار نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ سوچنا چاہئے کہ وہ عورت کسی کی بیٹی اور بہن ہو گی۔"

برکت علی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "آپ اس نوجوان کو جتنا جانتے ہیں اس سے زیادہ میں اس عورت کو جانتا ہوں کیونکہ وہ میری داشتہ رہ چکی ہے۔ اس کا نام شبنم ہے۔"

نواز صاحب اسے غیر یقینی نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس نے کہا۔ "میرے پاس شبنم کی ایسی ایسی تصویریں ہیں جنہیں دیکھ کر آپ کو یقین آ جائے گا۔ وہ تصویریں میں اپنی گھر والی سے چھپا کر یہاں دفتر میں رکھتا ہوں۔ ٹھہریئے! میں ابھی لاتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دفتر کے اندر چلا گیا۔

نواز صاحب نے پھر شبنم کی طرف دیکھا۔

فرہاد نے کار کا دروازہ کھول رکھا تھا لیکن وہ ایک دکان کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ شاید کچھ اور خریداری کے لیے کہہ رہی تھی۔

اف! یہ لڑکیاں اوپر سے کتنی اجلی نظر آتی ہیں لیکن ان کے اندر کتنی غلاظت بھری ہوتی ہے۔ پہلے وہ کسی کی بیٹی اور بہن نظر آ رہی تھی مگر اب وہ دیکھتے ہی دیکھتے ننگی ہو گئی تھی۔

انہوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنی بہن سے منہ پھیر رہے ہیں۔

عورت بہن ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی کی بہن ضرور ہوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی ہوس زیادہ اہم ہوتی ہے یا خون کا رشتہ؟ کیونکہ انسان کی ہوس سے داشتائیں جنم لیتی ہیں اور خون کے رشتے سے بہنیں۔ انسان کسی کی بہن کو داشتہ بناتا ہے اور خدا کا قانون کسی کی داشتہ کو بہن بنا دیتا ہے۔

برکت کے تصویریں لانے سے پہلے ہی وہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

☆============☆============☆

وہ اسی کے لیے رات گئے تک جاگتے رہے تھے۔ انہوں نے خیالوں کی تفریح گاہوں میں اسی حسینہ کو قدم قدم اپنے ساتھ دیکھا تھا اور اب اسے سامنے دیکھ کر بہکتے جا رہے تھے۔

عزت زینے پر چڑھتی ہوئی دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ زینے کے ہر پائیدان پر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اسے دفتر نہیں آنا چاہیئے تھا۔ فرہاد نے کہہ دیا تھا کہ وہ نواز صاحب سے آج شام کو ان کی کوٹھی میں ملاقات کرے گا۔

لیکن بھائی کے سمجھانے کے باوجود وہ آ گئی۔

دل جو نہیں مانتا تھا۔ بار بار کہتا تھا کہ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہوں نے اس کی خاطر چھٹی کے دن بھی دفتر کھولا ہو گا اور دفتر کے ساتھ دل کے دروازے کھول کر بڑے اعتماد سے اس کی راہ تک رہے ہوں گے۔

دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔

نواز صاحب اپنی ریوالونگ چیئر پر سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آہٹ سن کر انہوں نے سر اٹھایا۔ وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔

وہی پہلے والی عزت. آراء تھی جو ان کی کوٹھی میں انٹرویو کے لیے آئی تھی۔ سفید میرلن کی شلوار' سفید میرلن کی قمیض' سفید دوپٹہ سر پر سے ہوتا ہوا سینے اور شانوں سے اس طرح لپٹا ہوا جیسے سانپ جسم کے خزانے پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہو۔

اس کی سادگی میں ایسی دلربائی تھی کہ نواز صاحب تھوڑی دیر کے لیے فرہاد اور شبنم کی طرف سے پیدا ہونے والی خلش کو بھول گئے اور اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر اپنی انگوٹھی تلاش کرنے لگے۔

اس کے دائیں ہاتھ میں کہانی کا مسودہ تھا۔ وہ ہاتھ مسودے سمیت دل کی دھڑکنوں پر رکھا ہوا تھا۔ شاید اس ہاتھ کی کسی انگلی میں وہ انگوٹھی ہو گی۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ اس نے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو چھپا لیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میز کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میز پر مسودے کو رکھتے وقت دونوں ہاتھ عین نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ تمام انگلیاں خالی تھیں۔ انگوٹھی کی قید

سے آزاد تھیں۔

نواز صاحب کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

انہوں نے یہی سمجھا کہ عزت نے انگوٹھی قبول نہیں کی ہے۔ ان کے غرور اور خودداری کو ایسی ٹھیس پہنچی کہ وہ تلملا گئے۔ ایسے ہی وقت انہیں پھر شبنم اور فرہاد نظر آ گئے۔

یہ عزت خود کو سمجھتی کیا ہے؟

کیا عزت ہے اس کی؟ جس کا بھائی سرعام طوائفوں کے ساتھ گھومتا ہے اور بے غیرتی کو اپنی شان سمجھتا ہے۔ اس کی بہن نے میری پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ میں ایسوں کو کب قبول کرتا ہوں۔ میں بھی ٹھوکر مارنا جانتا ہوں۔

عزت نے نظریں جھکا کر کہا۔ "آپ.... کل اپنی انگوٹھی یہاں بھول کر چلے گئے تھے۔"

لہجے اور انداز میں ایسی معصومیت اور بھولپن تھا کہ نواز صاحب پھر نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔

ان کے سامنے حسن و شباب کا دلکش مجسمہ تھا۔ وہ اسی کے لیے رات گئے تک جاگتے رہے تھے۔ انہوں نے خیالوں کی تفریح گاہوں میں اسی حسینہ کو قدم قدم اپنے ساتھ دیکھا تھا اور اب اسے سامنے دیکھ کر پھر پگھل رہے تھے۔

دل نے سمجھایا غلطی اس کے بھائی کی ہے۔ اس کی نہیں ہے۔ اس کے بھائی کو نصیحت کی جا سکتی ہے پھر یہ کہ اس نے انگوٹھی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا ہے۔ وہ یہ سوچنے میں حق بجانب ہے' میں اپنی چیزیں یہاں اکثر بھول کر چلا جایا کرتا ہوں۔

انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ وہ انگوٹھی میں بھول کر نہیں گیا تھا۔ آپ کے لیے چھوڑ کر گیا تھا تو....؟"

اس نے سر کے آنچل کو ذرا آگے کر لیا۔ پھر ایک ہاتھ سے اس آنچل کا پردہ بنا کر بولی۔ "میری ایک غلطی سے وہ انگوٹھی بھائی جان کے ہاتھ لگ گئی۔ میں نے مجبوراً انہیں کل کا تمام واقعہ سنا دیا۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ آپ انگوٹھی قصداً چھوڑ گئے ہیں۔"

"آپ کے بھائی جان بہت سمجھدار ہیں۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے میں نے انہیں ایک

سمجھدار عورت کے ساتھ دیکھا ہے۔ کیا آپ اس عورت کو جانتی ہیں؟"

شبنم کے تصور سے عزت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بڑے پیار سے بولی۔

"وہ میری ہونے والی بھابھی ہیں۔"

"کیا آپ کے بھائی جان شبنم کے ماضی کو جانتے ہیں؟"

وہ بات ایسی تھی کہ عزت کے ذہن سے انگارے کی طرح چپک گئی۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ بات بگڑنے والی ہے۔ شاید نواز صاحب شبنم کے ماضی کو جانتے ہیں اسی لیے تو اس کا نام بھی جانتے ہیں۔

وہ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "کچھ عورتوں کی موجودہ زندگی میں ایسی پاکیزگی اور شرافت ہوتی ہے کہ ان کے ماضی کو بھلا دیا جاتا ہے۔"

"کیوں بھلا دیا جاتا ہے؟"

"اس لئے کہ بھٹکی ہوئی عورتوں کے دل میں راہ راست پر آنے کا حوصلہ پیدا ہو۔"

"میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ بھٹکی ہوئی عورت سزا کی مستحق ہوتی ہے اور سزا یہ ہوتی ہے کہ اسے شریف گھرانوں میں پناہ نہیں دی جاتی۔ وہ دربدر رسوا ہوتی ہے اور اس کی رسوائی سے دوسری عورتیں عبرت حاصل کرتی ہیں۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عورت مزید گناہوں سے بچنے کے لیے پناہ مانگے تو اسے پناہ نہ دی جائے بلکہ اسے اور زیادہ گناہگار بننے کے لیے بھٹکا دیا جائے۔"

نواز صاحب نے تلخی سے کہا۔ "آپ اس سماج کے قانون کو پیش نظر رکھ کر بحث کیجئے۔ کیونکہ ہمیں اسی سماج میں رہ کر زندگی گزارنی ہے۔"

عزت نے جواب دیا۔ "ہم قلمکار ہیں۔ ہم ہمیشہ اس سماج کی برائیوں کے خلاف لڑتے ہیں۔ کیا ایک عورت کی نیکی کی خاطر جنگ نہیں کر سکتے؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "یہ کتابی باتیں ہیں۔ آپ میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ جب ایک بدنام عورت کسی خاندان میں بہو بن کر آتی ہے تو اس خاندان کی شریف زادیوں کو رشتہ نہیں ملتا۔ صرف بدنامیاں اور طعنے ملتے ہیں۔ غلاظت کسی بھی گھر میں جائے گی تو تعفن پیدا کرے گی اور جہاں تعفن ہو' وہاں نفاست پسند لوگ نہیں جاتے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آگئے اور پیار بھرے لہجے میں بولے۔ "میں نے بہت کوششیں کیں لیکن آپ کو اشاروں کی زبان سے سمجھا نہ سکا۔ اب میں سیدھے سادے انداز میں کہنے پر مجبور ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

عزت کے دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں چہرے پر حیا کی لالی سلگنے لگی۔

انہوں نے کہا۔ "اگر آپ کو ناگوار گزرے تو مجھے کہنے سے روک دیجیے۔ عزت! میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے بیان نہیں کر سکتا کہ میری کیا حالت ہے۔ میں وقت پر سونا اور وقت پر کھانا بھول گیا ہوں۔ اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں بیمار ہو جاؤں گا۔"

انہوں نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

تھوڑی دیر تک وہ اس کے ہاتھ کی نزاکت کو اور ملائمت کو محسوس کرتے رہے' محظوظ ہوتے رہے۔

پھر بولے۔ "میں اس ہاتھ کو اب چھوڑنا نہیں چاہتا۔ تمہیں انکار تو نہیں ہے؟"

وہ بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ اندر ہی اندر مسرتوں کے ہجوم میں کانپ رہی تھی۔ نواز صاحب کے چھوتے ہی وہ خوابوں سے نکل کر ان کی سچی تعبیر تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے سوال کا جواب کس انداز میں دینا چاہیے۔ زبان سے اقرار کرتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "تم بہت شرمیلی ہو۔ میں جانتا ہوں' میری باتوں کا جواب اتنی آسانی سے نہیں دو گی۔ اچھا چلو۔ وہ انگوٹھی مجھے دے دو۔ میں اپنے ہاتھوں سے پہنا کر اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ تم میری بن چکی ہو۔"

وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ "وہ.... وہ انگوٹھی.... میرے پاس نہیں ہے...."

"گھر پر چھوڑ آئی ہو؟"

"جی.... جی نہیں.... بھائی جان آج شام کو آپ کے ہاں جائیں گے۔ انگوٹھی ان کے پاس ہے۔ وہ آپ سے کہنا چاہتے ہیں کہ دستور کے مطابق آپ کو ہمارے ہاں انگوٹھی لے کر آنا چاہیے۔"

انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں! دستور تو یہی ہے اور میں ضرور تمہارے دروازے پر

آؤں گا کیونکہ پیاسا ہمیشہ کنویں کے پاس جاتا ہے۔"

وہ سر جھکا کر زیر لب مسکرانے لگی۔

نواز صاحب اسے کس قدر چاہتے ہیں' یہ ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے اس کے دروازے پر سوالی بن کر آئیں گے۔ اس سے زیادہ عزت افزائی اور کیا ہو سکتی تھی۔

انہوں نے اس کے ہاتھ کو بھینچ کر کہا۔ "یہ اچھی بات ہے کہ تمہارے بھائی جان آج شام کو میرے ہاں آئیں گے۔ دیکھو نا! دستور کے مطابق جو بات کہی جائے اسے سب ہی تسلیم کر لیتے ہیں۔ میں بھی ان کی باتوں کو تسلیم کروں گا اور انہیں بھی سمجھاؤں گا کہ وہ سماج کے دستور کے مطابق کام کریں اور شبنم جیسی بدنام عورت سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھیں۔"

عزت کے چہرے کی مسکراتی ہوئی رنگت ماند پڑ گئی۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "مم.... مگر شبنم بھابھی بہت اچھی ہیں۔ صرف بھائی جان ہی نہیں ہم سب ان کی زندگی سنوارنا چاہتے ہیں۔"

نواز صاحب کے چہرے کی تازگی بھی مرجھانے لگی۔ انہوں نے کہا۔ "میں تم لوگوں کے نیک جذبوں کی قدر کرتا ہوں۔ گرتے ہوئے کو سنبھالنا اچھی بات ہے۔ لیکن اسے سنبھالتے وقت اپنے گرنے کا خدشہ پیدا ہو جائے تو ہمیں محتاط ہو جانا چاہیے۔

"شبنم کی زندگی سنوارنے کے اور بھی راستے ہیں۔ تم کہو تو میں یہاں کے دارالامان یا کسی فلاحی ادارے سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ وہاں بھٹکی ہوئی عورتوں کو پناہ مل جاتی ہے۔ ان کے لیے کہیں نہ کہیں سے رشتے بھی آ جاتے ہیں۔ کوئی انہیں بیوی بنا کر لے جاتا ہے اور کوئی بیٹی یا بہن بنا کر اپنے ہاں پناہ دیتا ہے۔"

عزت نے پوچھا۔ "نواز صاحب! کیا ایسے لوگ ہیں جو ایسی عورتوں کو بیٹی یا بہن بنا لیتے ہیں؟"

"ہاں.... اکثر ایسا ہوتا ہے۔ جن کی بیٹیاں نہیں ہوتیں وہ ان میں سے کسی کو بیٹی بنا لیتے ہیں جن کی بہنیں نہیں ہوتیں۔ وہ بہن بنا لیتے ہیں۔"

"آپ کی بھی کوئی بہن نہیں ہے۔ کیا آپ شبنم کو بہن نہیں بنا سکتے؟"

نواز صاحب کے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔

انہیں شبراتن عرف شبو یاد آ گئی۔ اس کی تلاش میں وہ ایک رات کوٹری تک گئے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے باپ کو تاکید کر دی تھی کہ شہر کی سڑکوں پر جب بھی چلیں تو ذرا توجہ سے پرائی بہو بیٹیوں کو دیکھا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں کہیں شبو نظر آ جائے۔

ان کی کوٹھی میں اب ایک گھریلو ماحول پیدا ہو رہا تھا۔ باپ آ گیا تھا۔ ماں کی کمی کو سوتیلی ماں نے پورا کر دیا تھا۔ عزت بھی ان کے دل کی ملکہ بن کر آنے والی تھی۔ صرف ایک بہن کی کمی رہ گئی تھی۔ جب تک شبو نہیں ملتی' اس وقت تک کیا وہ شبنم کو اپنی بہن نہیں کہہ سکتے تھے؟

نہیں!

انہوں نے کہا۔ "عزت! اس سوسائٹی میں میرا ایک مقام ہے۔ میں نے برسوں کی محنت سے دولت حاصل کی ہے۔ شہرت حاصل کی ہے۔ عزت حاصل کی ہے۔ کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ شبنم میرے یا تمہارے خاندان میں آئے گی تو لوگ کیسی کیسی باتیں بنائیں گے؟ میری عزت خاک میں مل جائے گی۔"

عزت نے پوچھا۔ "وہ ہمدرد لوگ جو ایسی عورت کو بہن بناتے ہیں کیا ان کی عزت خاک میں نہیں ملتی؟"

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ یوں سمجھ لو کہ دنیا میں عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں بھی وہی کام کرتا ہوں جس سے میری عزت و ناموس پر حرف نہ آئے۔"

عزت نے پہلی بار نظریں اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ وہ کتنے قریب تھے مگر کتنے دور نظر آ رہے تھے۔ ان کے درمیان نظریاتی اختلافات کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ آہستگی سے بولی۔ "آپ سے میری ایک التجا ہے۔"

"کیا؟"

"بھائی جان آپ کے ہاں آئیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ آپ نے قصداً میرے لئے انگوٹھی نہیں چھوڑی تھی۔ بلکہ یہاں بھول کر چلے گئے تھے۔"

انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ "مگر... میں تو تمہارے لئے چھوڑ گیا تھا۔"

"ہاں' لیکن میں نہیں چاہتی کہ انہیں ہماری محبت کا علم ہو۔"

"نہیں عزت! انہیں علم ہونا چاہئے۔ جبھی تو میں تمہارے رشتے کے لیے تمہارے ہاں آنے کا پروگرام انہیں بتاؤں گا۔"

"آپ فی الحال پروگرام ملتوی کر دیجئے۔ پہلے بھائی جان کی شادی ہونے دیجئے۔ پھر ہم اپنے متعلق سوچیں گے۔"

وہ کچھ سمجھ گئے اور کچھ نہیں سمجھ سکے۔ انہوں نے وضاحت چاہی۔ "تمہارے بھائی جان کی شادی کب ہوگی اور کس سے ہوگی؟"

"بھائی جان اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ میری بھابھی کے متعلق ان سے کوئی بات نہ کریں۔ اگر انہیں احساس ہو گیا کہ بھابھی کی وجہ سے میری خوشیاں برباد ہو رہی ہیں تو وہ سخت الجھن میں پڑ جائیں گے۔

"بھابھی کو معلوم ہوگا تو ان کے دل کو صدمہ پہنچے گا۔ بھائی جان بھی آزمائش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ بہن کی خاطر وہ اپنے نیک مقاصد سے ڈگمگا جائیں۔"

یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ آنچل سے آنکھیں پونچھتی ہوئی دروازے کی طرف جانے لگی۔

"عزت!"

ان کی آواز پر اس کے قدم رک گئے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا شبنم کی خاطر تم مجھ سے دور ہو جانا چاہتی ہو؟"

اس نے آنسو بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "میں ایک ڈوبنے والی عورت کو بچانا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اسے بچانے کے لیے مجھے ڈوب جانا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی بات کا جواب سننا گوارا نہیں کیا کیونکہ وہ نواز صاحب کی ضد کو سمجھ چکی تھی۔ اس لئے تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی دروازہ کھول کر چلی گئی۔

وہ تھوڑی دیر تک بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ شاید سوچ رہے تھے کہ عزت اپنے فیصلہ پر پچھتا کر واپس آئے گی۔

لیکن وہ منہ پھیر کر چلی گئی تھی۔

یکایک انہیں اپنی توہین کا احساس ہوا کہ عزت نے شبنم کو ان پر ترجیح دی ہے۔

سوسائٹی میں ان کی اتنی عزت تھی۔ لیکن عزت ان کی اہمیت کو نظرانداز کر کے ایک بدکار عورت کو اپنی بھابھی بنا رہی تھی۔

انہوں نے میز پر رکھے ہوئے مسودے کو غصہ سے دیکھا اور جھلا کر اسے ایک ہاتھ ایسا مارا جیسے عزت کے منہ پر طمانچہ مار رہے ہوں۔ مسودے کے اوراق زخمی پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے دور جا گرے۔

پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑائے۔ "گندی نالی کے کیڑے' آخر نالی میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ اسے میری کوٹھی کا صاف ستھرا ماحول پسند نہیں آیا۔ بلا سے پسند نہ آئے۔ اب وہ فرہاد میرے پاس آئے گا تو میں ذلیل کر کے اسے گھر سے نکالوں گا۔ یہ لوگ اسی قابل ہیں۔"

وہ غصے سے تلملاتے ہوئے دفتر سے باہر آئے اور دروازے پر تالہ ڈالنے لگے۔

☆==========☆==========☆

کیا ایسی مترنم آواز پہلے کبھی تمہارے دل سے اٹھی ہے؟

سچ بتاؤ۔ تنہائی میں یہ کھنکتی ہوئی چوڑیاں تم سے کیا کہہ رہی ہیں؟

فرہاد تپائی کے اوپر کھڑا ہوا کھڑکیوں پر پردے لگا رہا تھا اور شبنم فرش پر جھاڑو دے رہی تھی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی گرد اڑتی جا رہی تھی۔

فرہاد نے کھانستے ہوئے کہا۔ "اوہو' تم تو سارے کمرے میں گرد اڑا رہی ہو۔ کیا اسی طرح جھاڑو دی جاتی ہے؟"

وہ پھر کھانسنے لگا۔ شبنم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کھڑکیوں سے پردے ہٹا دیجئے گرد باہر چلی جائے گی۔ جو کام بعد میں ہونا چاہئے' اسے آپ پہلے کرتے ہیں۔ ابھی پردے لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"

فرہاد نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کہا۔ "میں اپنی دلہن کا گھر سجا رہا ہوں۔ تم بولنے والی کون ہوتی ہو؟"

شبنم کی گردن جھک گئی۔ وہ شرمانے اور مسکرانے لگی۔

فرہاد بھی اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ جب سے شاپنگ کر کے اس کے ساتھ آئی تھی' جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھی۔ اس کی ساڑھی میلی ہو گئی تھی جسم پر گرد جمی ہوئی تھی اور سر کے بال ایسے بکھر گئے تھے کہ بار بار چہرے پر آ رہے تھے۔

فرہاد نے بڑے پیار سے کہا۔ "ذرا آئینہ دیکھو' کیا حالت بنا رکھی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ملازمہ کو رکھ لو مگر تم نے اسے جواب دے دیا۔"

وہ کچرے کو چھوٹے سے ڈسٹ بن میں ڈالتی ہوئی بولی۔ "یہ ہمارا گھر ہے۔ میرا اور آپ کا گھر ہے۔ آپ کی مرضی سے اس کی سجاوٹ ہو گی اور میری محنت سے یہ گھر صاف ستھرا رہے گا۔ میں آپ کے لیے چولہا جلاؤں گی۔ روٹیاں پکاؤں گی۔ اور اپنے ہاتھوں سے برتن مانجھوں گی۔ کسی ملازمہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ یہ کام کرے۔ آپ کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔"

فرہاد تپائی سے اتر کر اس کے قریب آ گیا اور اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ

فرش پر اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک طرف جھاڑو اور دوسری طرف ڈسٹ بن رکھا ہوا تھا اور وہ اپنے آنچل سے چہرے کی گرد صاف کر رہی تھی۔

فرہاد نے اس کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لیا تو وہ چپ چاپ سر جھکا کر اس کے برابر کھڑی ہو گئی۔

"شبنم! یہ محنت سے تھکا ہوا چہرہ اور بکھرے ہوئے بال بہت بھلے لگ رہے ہیں۔

"میں تمہیں دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ یہ عورت جو اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے۔ یہ ساری کی ساری میری ہے۔ یہ سوچتی ہے تو میرے لئے' بولتی ہے تو میرے لئے' یہ میرے لئے محنت کرتی ہے اور میرے لئے تھک جاتی ہے اور اپنی تھکن کو چھپانے کے لیے مجھے اپنی مسکراہٹوں سے بہلاتی ہے لیکن میں اتنا نادان نہیں ہوں۔ اب میں تمہیں اتنی محنت نہیں کرنے دوں گا۔ کل اس ملازمہ کو واپس بلا لو۔"

"مگر اب تو اتنا کام نہیں ہے۔"

"بحث نہ کرو۔ یہ بتاؤ اس گھر میں کس کا حکم چلے گا؟"

"آپ کا۔ اب میں بحث نہیں کروں گی۔ کل ملازمہ کو بلا لوں گی۔"

"شاباش۔ یہ دیکھو گھر کا حلیہ بدل گیا ہے۔ اب اپنا حلیہ بھی بدل ڈالو۔"

"پلنگ کی چادر بچھانے دیجئے۔ پھر میں غسل کرنے جاؤں گی۔"

وہ فرہاد کے پاس سے صوفہ کے قریب آ گئی۔ وہاں بازار سے خرید کر لائی ہوئی چادر اور تکئے کے غلاف رکھے ہوئے تھے۔ وہ چادر اٹھا کر پلنگ پر بچھانے لگی۔

چادر بچھتے ہی فرہاد تھکے ہوئے انداز میں لیٹ گیا۔ شبنم پلنگ کے سر پر بیٹھ کر تکیے غلاف چڑھانے لگی۔

کمرے کی خاموشی میں ہولے ہولے چوڑیوں کا ترنم جاگ رہا تھا۔ غلاف چڑھاتے وقت ہاتھ اِدھر سے اُدھر ہو رہے تھے اور چوڑیاں بج رہی تھیں۔

فرہاد بڑی لگن سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عورت خاموش رہ کر بھی چوڑیوں کی سرگوشیوں سے توجہ کو پکارتی ہے۔

اے میرے محبوب! مجھے دیکھو۔

میں ایک ساز ہوں جس کی آواز تمہارے دل سے اُٹھ رہی ہے۔

کیا ایسی مترنم آواز پہلے کبھی تمہارے دل سے اُٹھی ہے؟
سچ بتاؤ۔ تنہائی میں یہ کھنکتی ہوئی چوڑیاں تم سے کیا کہہ رہی ہیں؟

فرہاد لیٹے ہی لیٹے ذرا سی اٹھا اور ایک ہاتھ کی کہنی ٹیک کر اس کے قریب ہو گیا۔

"شبنم!"

"جی!"

اس نے اپنا سر شبنم کے شانے پر رکھ دیا۔ اس کی اُجلی گردن سانسوں کی آنچ سے تپنے لگی۔ تکیہ ہاتھ سے چھوٹ کر پلنگ کے نیچے گر پڑا۔

"شبنم! وہ کوٹھی ہم نے چھوڑ دی کیونکہ وہ ہمارے قابل نہیں تھی۔ یاد ہے' تم نے کہا تھا کہ تمہیں ہاتھ لگانے سے پہلے میں وہاں سے تمہیں کہیں دور لے جاؤں۔ اپنا ایک گھر بناؤں' جہاں ایمانداری سے ہمارے درمیان رشتہ ہو سکے۔"

شبنم کے رخساروں پر حیا کی لالی آ گئی۔

فرہاد نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔

"ہم نے بڑے اعتماد سے یہ گھر بسایا ہے۔ اس اعتماد سے کہ کوئی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا۔ سماج کی نفرتیں اور تنقیدیں اس گھر کی چار دیواری میں نہیں آ سکیں گی۔ اگر آئیں گی تو ہم ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں گے۔"

شبنم نے بڑی محبت اور عقیدت سے اسے دیکھا اور اپنی باہیں اس کی گردن میں حمائل کرتی ہوئی بولی۔ "اتنی ساری خوشیاں دیکھ کر کبھی کبھی یقین نہیں آتا کہ میں جاگ رہی ہوں۔ یہ سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔ دل ڈرتا ہے کہ کہیں یہ خواب ٹوٹ نہ جائے۔"

"یہ خواب نہیں ہے پگلی۔ یہ لو میں تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر رہا ہوں۔ یقین کر لو۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہونٹوں کو شبنم کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر اتار دیا اور اس کے دل کے دروازے پر دستک دینے لگا۔ دھک.... دھک.... دھک.... دھک.... دھک.... دھک....

"مجھے یقین ہے' مجھے یقین ہے فرہاد کہ آپ میرے خوابوں کی تعبیر بن گئے ہیں۔"

فرہاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں رفتہ رفتہ بہت سی خوشیوں کا یقین آئے گا۔ ایک خوشخبری سنانا تو بھول ہی گیا۔ عزت کا رشتہ بھی بہت جلد طے ہونے والا ہے۔"

"سچ؟" اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کہاں طے ہو رہا ہے؟"

"جس ادارے میں وہ کام کرتی ہے.... اسی ادارے کے مالک سے منسوب ہونے کی توقع ہے۔ ان کا نام نواز احمد درانی ہے۔ آج شام کو پانچ بجے میں ان سے ملنے جاؤں گا۔"

وہ کچھ سوچنے لگی۔

فرہاد نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں سوچ رہی ہوں کہ وہ ادارے کے مالک ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہوں گے۔ بہت بڑا خاندان ہوگا۔"

"ہاں.... وہ خاندانی لوگ ہیں۔"

اس کا دل فرہاد کے سینے سے لگا دھڑک رہا تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ "لڑکی سے رشتہ کرنے سے پہلے لوگ اچھی طرح چھان بین کرتے ہیں۔ کیا.... کیا نواز صاحب میرے متعلق کچھ جانتے ہیں؟"

فرہاد کو اس سوال کے پیچھے ایک تاریک جان لیوا گہرائی نظر آئی۔ جواب دیتے ہوئے وہ اس سوال کی اندھی گہرائی میں گر سکتا تھا۔ اس نے ٹالنے کے لیے کہا۔ "نواز صاحب کو تمہارے متعلق جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم میری ہو.... میں تمہیں جانتا ہوں.... اور سمجھتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لیے پرخلوص ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات نہیں ہے۔ عزت باجی کی ازدواجی زندگی کا مسئلہ ہے۔ ایک جوان لڑکی جہاں بیاہ کر جاتی ہے' وہاں کے لوگ اس کے میکے والوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ جن میں عیب نہیں ہوتا' ان کے بھی عیب نکالے جاتے ہیں۔ اور میں تو.... میں تو...."

وہ آگے نہ کہہ سکی۔ اس سے پہلے ہی فرہاد نے اس کی آواز پر اپنے ہونٹوں کی مہر لگا دی۔

تھوڑی دیر تک گہری خاموشی طاری رہی۔

تھوڑی دیر کے لیے زندگی کی تلخیوں کو فرہاد نے بوسے کی مٹھاس میں گھول دیا۔

پھر اس کے بعد کہا۔ "تم اپنے ماضی کی کتاب کبھی نہ کھولنا۔ یہ میں تمہیں پہلے ہی سمجھا چکا ہوں۔"

"میں اپنے ماضی کی کتاب بند کر چکی ہوں فرہاد۔ میں تو عزت باجی کے مستقبل کا پہلا ورق الٹنا چاہتی ہوں۔ ہم نے جذباتی انداز میں ایک دوسرے کے متعلق سوچا اور عزت باجی کو بھول گئے۔ مگر اب ان کے مستقبل کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اب ہمیں ان کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔"

"تم سوچنے کی بات کرتی ہو' ہم تو اس کے ہاتھوں میں مہندی رچائیں گے اور اسے دلہن بنا کر عزت و آبرو سے رخصت کریں گے۔ تمہارے دل میں خواہ مخواہ اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔"

"خدا کرے کہ یہ اندیشے غلط ثابت ہوں۔ لیکن فرہاد اگر ہم پہلے سے احتیاطی تدابیر کرلیں تو کیا حرج ہے؟"

اس نے تعجب سے پوچھا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

وہ کہتی ہوئی ہچکچانے لگی۔ "میں... میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ.... ہم.... ہم ابھی اپنی شادی کے متعلق نہ سوچیں۔ عزت باجی کی شادی ہو جائے گی۔ تو پھر ہم ایک ہو جائیں گے۔"

"کیا کہہ رہی ہو۔ کل امی تمہیں انگوٹھی پہنانے آئیں گی۔"

شبنم کی دل میں خوشی کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ بہت سی آرزوئیں سر اٹھا کر گنگنانے لگیں۔ ایک شریف خاندان کی معزز خاتون یہاں آ کر اسے انگوٹھی پہنائے گی' اسے بہو تسلیم کرے گی اور اسے اپنے بیٹے کے ساتھ ایک نیا گھر بسانے اور نئی زندگی گزارنے کی دعائیں دے گی۔

ہائے.... وہ اپنی منزل کے کتنے قریب پہنچ گئی ہے۔

آہ.... وہ اپنی منزل پر پہنچ کر واپس لوٹنا چاہتی ہے کیونکہ وہ عزت کو بہت پیچھے راستے میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی۔ وہ خود بہت عرصہ تک تنہا بھٹک چکی تھی۔ بدنامیوں کے خبیث چہرے دیکھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے ایک شریف لڑکی بن بیاہی بیٹھی رہ جائے۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میں جانتی ہوں' امی مجھے دعائیں دیں گی۔ انگوٹھی کل نہ سہی' سال بھر کے بعد بھی پہنائی جا سکتی ہے۔ ابھی آپ ہماری منگنی کا خیال دل سے نکال دیجئے۔"

"نہیں شبنم! میں تمہیں جلد سے جلد اپنانا چاہتا ہوں۔ میں جو فیصلہ کر چکا ہوں اس سے تم انکار نہیں کر سکتیں۔ کیا انکار کرو گی؟"

اس نے جواب نہیں دیا' خاموش رہی۔

اسے خاموش دیکھ کر فرہاد نے پھر پوچھا۔ "جواب دو' کیا انکار کرو گی؟"

وہ آہستگی سے بولی۔ "اگر میرے انکار کرنے سے عزت باجی کی زندگی سنور سکتی ہے تو مجھے انکار ہے۔"

فرہاد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی محبوبہ اسے اہمیت نہیں دے رہی ہے۔ اس نے غم اور غصہ کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔ "کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

"فرہاد' صرف آپ سے محبت کروں گی تو یہ میری خودغرضی ہوگی۔ مجھے آپ کی امی سے اور آپ کی بہن سے بھی اتنی ہی محبت کرنی ہوگی۔ ورنہ میں ایک خوشگوار گھریلو زندگی نہیں گزار سکوں گی۔ مجھے اپنی نند کی نیک نامی اور مستقبل کے متعلق سوچنے کا حق ہے۔ آپ مجھ سے میرا یہ حق کیوں چھین رہے ہیں؟"

فرہاد کے ذہن سے دھند چھٹ گئی۔

اس نے اپنی محبوبہ کو دیکھا۔ اس کا ظاہر ہی نہیں باطن بھی شبنم کے مصفا قطروں کی طرح اُجلا تھا۔ وہ اس اُجلے دمکتے ہوئے وجود کا قطرہ قطرہ چومنے لگا۔ نفس نفس خراج تحسین دینے لگا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم اپنی گھریلو زندگی اور اپنے فرائض کو جتنی اچھی طرح سمجھتی ہو' اتنی اچھی طرح میں نہیں سمجھ سکتا۔ تم نے اپنی ذہانت سے' اپنی باتوں سے اور اپنی اداؤں سے اتنا متاثر کیا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

"میں تمہارے اس مشورے کو تسلیم کرتا ہوں۔ اب ہماری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ جلد سے جلد عزت کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔

"لیکن یہ بات یاد رکھو شبنم کہ عزت کے بیاہنے کے بعد بھی، دنیا والوں سے ہماری جنگ ختم نہیں ہوگی۔ گھسی پٹی شرافت کا دم بھرنے والے ہر قدم پر ہماری مخالفت کریں گے۔

"ابھی ہمارے سامنے ایک لمبی عمر پڑی ہے۔

"کتنے ہی خواب ہیں جو تعبیر کے لیے مچل رہے ہیں۔

"میرے سامنے یہ چھوٹا سا گھر ہے' اور تم ہو۔

"تم..... جو میرے پیار کی ابتداء ہو۔

"اس پیار سے ابھی کتنے ہی پھول مہکیں گے۔

"میرے بچے تمہاری کوکھ میں پرورش پائیں گے۔

"تم ماں ہوگی۔ اور میرے بچوں کو مکمل انسان بناؤ گی۔

"پھر ان بچوں کے سامنے مخالفتیں جنم لیں گی۔

"لوگ پوچھیں گے کہ ان بچوں کی ماں کون ہے؟ اور وہ کیا تھی؟ اور وہ اس شریف سماج میں کہاں سے آئی تھی؟

"ہم اس وقت بھی سماج سے لڑیں گے۔ بوڑھے ہونے کے باوجود لڑیں گے۔ کیونکہ اس وقت ہم تنہا نہیں ہوں گے۔ اس وقت ہماری اس جنگ میں ہمارے بچے ہماری نسل بھی ہمارے شانہ بہ شانہ ہوگی۔"

آہ... کتنا حوصلہ اور کتنی مضبوط اور مستحکم امیدیں جنم لے رہی تھیں۔ دور دور تک مستقبل روشن ہوتا جا رہا تھا۔ اس جنم جلی کی کوکھ میں ان دیکھے اور ان چھوئے بچے ہمک رہے تھے اور خیالوں کے پالنے میں ننھے منھے ہاتھ اٹھا کر پکار رہے تھے۔

امی... میری امی.... ہماری امی! آپ سوچتی کیوں ہیں؟ روتی کیوں ہیں؟ ہم آ رہے ہیں آپ کا خون پینے والوں نے آپ کی توہین کی ہے مگر آپ کا دودھ پینے والے بچے آپ کے لیے ڈھال بن جائیں گے۔ اب آپ تنہا نہیں ہیں۔ پھر آپ روتی کیوں ہیں؟

وہ رو رہی تھی' زندگی کے کرب سے اور مستقبل کی خوشگوار امید سے۔

وہ رو رہی تھی' اپنے محبوب کے پیار کی دیوانگی اور ممتا کی تڑپ سے۔

وہ آنسو نہیں تھے' امیدوں اور آرزوؤں کی برسات تھی۔ فرہاد اس بارش میں بھیگ

رہا تھا اور اسے ایک حسین مستقبل کی بشارت دے رہا تھا۔

☆============☆============☆

میں آپ کے لیے اجنبی ہوں اور آپ نے مجھے گھر کے اندر آنے کی اجازت دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اجنبیوں سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتی ہیں۔

نواز صاحب کا سکون برباد ہو چکا تھا۔ عجیب اضطراب کا عالم تھا۔ اندر ہی اندر لاوا سا پک رہا تھا۔ وہ لاوا تھا۔ شبنم اور فرہاد سے نفرت کا۔ وہ لاوا تھا عزت سے بے انتہا محبت کا۔ ... اور شدید غم و غصہ کا۔ غم اس بات کا تھا کہ اس نے شبنم کی خاطر انہیں نظرانداز کیا تھا اور غصہ اس بات کا تھا کہ وہ عزت کے لئے دل ہار بیٹھے تھے یعنی انہیں اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے ماہنامہ "عزت" کا اجراء کر کے سخت غلطی کی ہے۔ نہ اس رسالے کی اشاعت کا پروگرام بنتا اور نہ عزت ان کے اتنے قریب آتی۔ مگر نہیں، صرف عزت ان کے قریب نہیں آئی تھی، وہ بھی اس کے قریب ہوتے گئے تھے۔ دونوں طرف برابر کی آگ لگی تھی۔

اب یہ آگ کیسے بجھے گی؟

جس طرح وہ پرانے مسودے فائل سے نکال کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔ کیا اسی طرح عزت کو پیار کا ردی مسودہ سمجھ کر دل کی فائل سے نکال سکتے ہیں؟

نہیں، یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

پھر بھی انہوں نے خود کو بہلانے کی کوشش کی۔ آفس سے نکل کر گھنٹوں کار میں گھومتے رہے تاکہ باہر کی رونق اور چہل پہل دیکھ کر وہ عزت کو کم از کم تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیں۔

موسیقی بہت سی پریشانیوں کو تھپک کر سلا دیتی ہے۔ انہوں نے ریڈیو آن کر دیا۔

سوئچ آن کرتے ہی انہیں وہ رات یاد آ گئی جب عزت ان کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی تھی اور ریڈیو سے ڈرامہ نشر ہو رہا تھا۔ اب جتنی دیر تک ریڈیو بولتا رہتا، عزت بھی ان کی سوچ میں گنگناتی رہتی۔

انہوں نے ریڈیو کو بند کر دیا۔

وہ کلفٹن گئے۔

وہ ہل پارک کی سیر کرتے رہے۔

وہ شالیمار نرسری کی سیر کرتے رہے۔

وہ شالیمار نرسری کے جھیل کنارے ٹہلتے رہے۔

لیکن وہ ہر مقام پر کسی نہ کسی روپ میں ان کے سامنے آگئی۔

کسی لڑکی کا لباس دیکھ کر اس کا لباس یاد آگیا۔

کسی کے چلنے کا انداز.... کسی کی گفتگو کی مٹھاس.... سریلی آواز کا سحر.. تبسم کی لجائیت.... نگاہوں کی اپنائیت.... مشابہت ہر جگہ تھی.. درخت سے چھن چھن کر آنے والی اُجلی چاندنی کی طرح عزت کا حسن اس شہر کی تمام لڑکیوں میں ذرا ذرا تقسیم ہو گیا تھا۔

تھک ہار کر انہوں نے دل ہی دل میں تسلیم کر لیا کہ ان کے دل و دماغ سے وہ فراموش نہیں کی جاسکتی۔

اور پھر وہ اسے بھلا کیوں رہے ہیں؟

آخر عزت کا قصور کیا تھا؟

صرف یہی کہ اس نے ان کی مرضی کے خلاف فیصلہ کیا تھا لیکن اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ان سے محبت نہیں کرتی ہے۔ اس نے شادی سے انکار نہیں کیا تھا صرف اس وقت تک کے لیے شادی کا پروگرام ملتوی کرنے کے لیے کہا تھا جب تک کہ اس کے بھائی جان اور شبنم کی شادی نہ ہو جائے۔

دراصل ان کی پریشانیوں کی وجہ عزت نہیں تھی۔

شبنم تھی۔

ان کے دل کا غبار ذرا چھٹنے لگا۔

آہستہ آہستہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے انہوں نے سوچا کہ وہ عزت سے نفرت نہیں کر سکتے' شکایت کر سکتے ہیں۔ اس نے ایک بھٹکی ہوئی عورت کے متعلق جذباتی انداز میں سوچا ہے اور اسے بھابھی بنانے کا احمقانہ فیصلہ کیا ہے۔

بہرحال اتنا زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں تھی۔ آپس میں اختلافات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں' کبھی صلح صفائی ہو جاتی ہے۔ آج عزت جذباتی

انداز میں سوچ رہی ہے' کل وہ پچھتا سکتی ہے۔

"اسٹاپ.... رک جایئے!"

سامنے سڑک پر سرخ رنگ سے لکھا ہوا تھا کہ راستہ زیر مرمت ہے۔ انہوں نے کار دائیں جانب ایک گلی میں موڑ دی۔ اس گلی کے مختلف پیچ و خم کے بعد آگے جا کر پھر یہ راستہ مل جاتا تھا لیکن گلی کے ایک موڑ سے ٹرننگ لیتے ہی انہوں نے کار روک دی۔

ان کے بائیں جانب ایک چھوٹا سا پختہ مکان تھا اس کے برآمدے میں کھڑی ہوئی عورت کو دیکھ کر انہیں ایسا لگا تھا جیسے انہوں نے شبنم کو دیکھا ہو۔

وہ شبنم ہی تھی۔ دھوپ میں کھڑی ہوئی اپنے بھیگے بالوں کو تولیہ سے جھٹک رہی تھی۔ اس وقت وہ گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے اور گنگناتی ہوئی سریلی آواز سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کے محبوب نے اسے اتنی ساری خوشیاں دی ہیں کہ وہ تنہائی میں گنگنا کر ان کا اظہار کر رہی ہے۔

نواز صاحب دور کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لئے اس کی گنگناہٹ کو نہ سن سکے۔ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ اگر یہ عورت ہمارے راستے سے ہٹ جائے تو ان کے اور عزت کے درمیان جو اختلاف ہے وہ ختم ہو جائے گا۔

بس یہی ایک عورت ہے جو ان کے راستے پر "اسٹاپ" کے سرخ بورڈ کی طرح کھڑی ہوئی ہے اور عزت تک پہنچنے سے روک رہی ہے۔

وہ اپنی کار سے باہر آگئے۔

شبنم تولئے کو اپنے شانے پر رکھ کر مکان کے اندر جا رہی تھی۔

انہوں نے مکان کے احاطہ میں قدم رکھتے ہوئے سوچا کہ فرہاد بھی یقیناً یہاں موجود ہوگا۔ چلو اچھا ہے' وہ انگوٹھی کے سلسلہ میں مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ بھی یہاں تفصیلی گفتگو ہو جائے گی۔

دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا پھر بھی انہوں نے دستک دی۔

دور کہیں سے شبنم کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کون.... جسٹ اے منٹ!"

تھوڑی دیر کے بعد وہ ساڑھی کا آنچل سر پر رکھتی ہوئی دروازے پر آگئی اور انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

نواز صاحب نے اسے دور سے دیکھا تھا۔ اب قریب سے دیکھتے ہی انہیں محسوس ہوا کہ وہ بہت پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکے ہیں۔ کہاں دیکھا ہے' یہ انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔ شبنم کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی چمک پیدا ہوئی پھر اس نے پوچھا۔ "فرمایئے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میں فرہاد صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"فرہاد صاحب!" اس نے تعجب سے پوچھا۔ "آپ کیسے جانتے ہیں کہ فرہاد صاحب یہاں رہتے ہیں؟"

"کیا میں غلط جگہ آ گیا ہوں؟"

"جی نہیں۔ آپ صحیح جگہ آئے ہیں لیکن ہم آج ہی صبح اس مکان میں آئے ہیں۔ آپ کو یہاں کا پتہ کیسے معلوم ہو گیا؟"

انہوں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آپ کو دیکھ کر فرہاد صاحب کا پتہ چل جاتا ہے۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا آپ پر نظر پڑی تو یہاں آ گیا۔"

شبنم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ حالانکہ انہوں نے طنز کیا تھا مگر شبنم کے لیے یہ بات قابل فخر تھی کہ اسے دیکھ کر لوگ اس کے فرہاد کو تلاش کر لیتے ہیں۔

اس نے اخلاقاً کہا۔ "تشریف لایئے۔"

وہ مکان میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ "معلوم ہوتا ہے فرہاد صاحب نہیں ہیں۔"

"نہیں' وہ کسی کام سے گئے ہیں۔ آٹھ بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔"

نواز صاحب نے اسے حقارت سے دیکھ کر کہا۔ "میں آپ کے لیے اجنبی ہوں اور آپ نے مجھے گھر کے اندر آنے کی اجازت دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ اجنبیوں سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتی ہیں۔"

شبنم نے جواب دیا۔ "جی نہیں۔ کسی شریف آدمی کو گھر میں بلانے کا مطلب بے تکلفی نہیں ہے۔ میرے گھر کا دروازہ کھلا ہونے کے باوجود آپ دستک دے رہے تھے۔ آپ کی اتنی سی شرافت میرے لیے کافی ہے۔ پھر یہ کہ آپ اجنبی نہیں ہیں۔ میں آپ کا نام نہیں جانتی' اتنا جانتی ہوں کہ آپ بخاری صاحب کے پڑوسی ہیں۔"

انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "مجھے بھی کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "میں آپ کو بتاتی ہوں۔ آج سے دو سال پہلے بخاری صاحب کے ہاں شادی کی تقریب میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ تمام لوگ بوفے اسٹائل سے کھڑے ہو کر کھا رہے تھے۔ آپ بھی ہیٹر کے قریب کھانے میں مصروف تھے۔ یکایک ہیٹر کی آگ نے آپ کی کیرلن کی قمیض کو چھو لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ آپ کو اس آگ کی خبر ہوتی میں نے اپنی چائے کی پیالی آپ کی قمیض پر پھینک دی۔

"آپ نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور اس توہین پر آگ بگولا ہو گئے کہ ایک عورت نے اپنی جھوٹی چائے آپ پر پھینکی ہے۔

"وہ تو خیریت ہوئی کہ ثبوت کے طور پر آپ کی قمیض کا پچھلا دامن آگ کے شعلے سے جھلسا ہوا نظر آ گیا ورنہ آپ مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔"

نواز صاحب اسے ایک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔ دو سال پہلے کے واقعہ کی پوری تفصیل ان کی نگاہوں کے سامنے آ گئی تھی۔

انہوں نے روکھے لہجے میں کہا۔ "اپنا جھوٹا کسی پر پھینکنا سراسر بدتمیزی ہے۔ آپ کے قریب پانی کا گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ کیا آپ پانی سے آگ نہیں بجھا سکتی تھیں؟"

شبنم نے حیرت سے کہا۔ "تعجب ہے آج بھی آپ کو یہی شکایت ہے۔ آپ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ آگ بھڑکتی دیکھ کر بدحواسی میں کچھ نہیں سوجھتا۔ میرے ہاتھ میں چائے تھی۔ میں نے چائے سے بجھا دی۔ جتنی دیر میں پانی کا گلاس اٹھانے کے لئے گھومتی اور اسے استعمال کرتی' اتنی دیر میں آگ اور زیادہ بھڑک جاتی۔

"لیکن آپ کا فلسفہ کچھ عجیب ہے۔ خطرے کے وقت بھی آپ دوسروں کو تمیز کے طریقے سکھاتے ہیں۔ بہرحال میں نے نیکی کرنی چاہی تھی وہ آپ کے لیے برائی ہو گئی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ اب آپ پچھلی باتوں کو بھول جایئے۔ یہاں تشریف رکھئے' آپ تو ابھی تک کھڑے ہوئے ہیں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے پھر انہوں نے کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ پچھلی باتوں کو بھول جانے کے لیے کہہ رہی ہیں۔ حالانکہ ماضی کبھی بھلایا نہیں جاتا۔ خواہ مرد کا ماضی ہو' یا عورت کا ماضی۔"

شبنم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "بھولنا یا نہ بھولنا حالات پر منحصر ہے۔ وہ ماضی جس سے مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے' یاد رکھا جاتا ہے ورنہ بھلا دیا جاتا ہے۔ کل جہاں کھنڈر تھا' آج وہاں تاج محل ہے۔ دنیا نے کھنڈر کو بھلا دیا' لیکن اس کھنڈر سے اٹھنے والے اس تاج محل کو قیامت تک نہیں بھلا سکے گی۔"

نواز صاحب نے کہا۔ "انسانی زندگی پر بات چلے تو بے جان عمارتوں کی مثالیں دل کو نہیں لگتیں۔ ویسے بھی میں بحث کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں تو فرہاد صاحب سے ملنے کے لیے یہاں اس لئے آ گیا کہ مجھے ان کا گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے ورنہ دستور کے مطابق مجھے ان کی امی کے پاس جا کر رشتہ کی بات کرنی چاہئے۔"

شبنم نے چونک کر پوچھا۔ "رشتہ کی بات.... کک.... کس سے رشتہ۔ مم.... میرا مطلب ہے کیا.... کیا آپ عزت باجی کے لیے بات کریں گے؟"

"جی ہاں!"

"اوہ.... میں بھی عجیب ہوں۔ میں نے اب تک آپ کا نام نہیں پوچھا...."

"میرا نام نواز احمد درانی ہے۔"

وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ جلدی جلدی سر کا آنچل درست کرنے لگی۔ پھر کچھ گھبراہٹ کے اور کچھ خوشی کے ملے جلے لہجہ میں بولی۔ "میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ آپ میرے ہاں تشریف لائے ہیں۔ فرہاد صاحب ابھی آپ کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ ابھی پانچ بجے آپ کے ہاں جانے والے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں بھی اسی سلسلہ میں گفتگو کرنے آیا ہوں۔ دیکھئے! شادی بیاہ گڑیوں کا کھیل نہیں ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر' لڑکی اور اس کے خاندان والوں کو دیکھ سمجھ کر رشتہ طے کرنا پڑتا ہے۔ پہلے مجھے اس کا تجربہ نہیں تھا لیکن ایک جگہ منگنی ہونے کے بعد میں نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔"

"کس کی منگنی؟" شبنم نے پوچھا۔

نواز صاحب نے جواب دیا۔ "میری منگنی.... لیکن میں نے وہ منگنی توڑ دی ہے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اس لڑکی کے خاندان میں ایک طوائف بیاہ کر آئی تھی۔"

شبنم کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ چہرے پر ایسی زردی چھا گئی جیسے نواز صاحب نے ایک ہی بات سے اس کا خون نچوڑ لیا ہو۔

انہوں نے کنکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس منگنی کے ٹوٹنے کا افسوس ہے کیونکہ وہ لڑکی بہت اچھی تھی۔ اس میں کوئی عیب نہیں تھا لیکن میں کیا کرتا۔ باہر میری عزت ہے۔ لوگ میری قدر کرتے ہیں اگر ان میں سے کسی کو معلوم ہو جائے کہ لڑکی کے میکے میں ایک بدنام عورت رہتی ہے تو کیا میں کسی سے آنکھ ملا کر بات کر سکوں گا؟"

"مم.... مگر.... وہ عورت.... اگر نیکی اور شرافت سے زندگی گزارتی ہو تو دنیا والوں کو سمجھایا جا سکتا ہے۔"

"بکواس ہے۔ ہم دن رات کاروبار میں سر کھپاتے ہیں' شادی اس لئے کرتے ہیں کہ آرام و سکون میسر ہو۔ اگر ایسی بدنامیاں اور پریشانیاں گلے پڑ جائیں تو پھر تھکے ہوئے ذہن کو سکون کہاں ملے گا۔

"صاف بات تو یہ ہے کہ شادی وہاں کی جائے جہاں ایک خیال اور ایک نظریہ کے لوگ ہوں لیکن آپ کو تو میرے نظریئے سے اختلاف ہے۔"

شبنم نے جلدی سے کہا۔ "نن.... نہیں۔ مجھے آپ سے اختلاف نہیں ہے۔ آپ.... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایک بدنام عورت کی خاطر برسوں کی بنائی ہوئی عزت کو مٹی میں نہیں ملانا چاہئے۔ آپ جیسے مصروف لوگوں کے لیے آرام و سکون ضروری ہے۔"

نواز صاحب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ بہت سمجھدار ہیں۔ بہت سی لڑکیاں خودغرض ہوتی ہیں۔ دوسروں کی عزت اور خاندانی شرافت کا ذرا خیال نہیں کرتیں۔ ارے ہاں' میں تو پوچھنا ہی بھول گیا کہ فرہاد صاحب کے گھر والوں سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"کک.... کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"اچھا.... لیکن میں نے اکثر آپ کو فرہاد صاحب کے ساتھ دیکھا ہے۔"

"وہ.... وہ میرے بزنس پارٹنر ہیں۔ ان کی محنت ہے اور میرا سرمایہ ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔ اور کچھ بھی نہیں...."

فرہاد سے بیگانگی ظاہر کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

آہ.... وہ کیسے کہے کہ وہ بزنس پارٹنر نہیں بلکہ لائف پارٹنر ہے۔

اس کی زندگی کی ایک ایک سانس کا نام فرہاد ہے۔ وہ فرہاد کے رشتہ کو جھٹلا رہی ہے یا اپنی زندگی سے ناطہ توڑ رہی ہے۔

فرہاد اس کا کوئی نہ ہو گا تو پھر اس کی زندگی میں کیا ہو گا۔ کچھ نہیں۔ یہ دنیا اس کے لیے مرجائے گی۔

دنیا کب کسی کے لیے مرتی ہے۔ وہی دنیا کے ہاتھوں مرجائے گی۔

اور اب مرنے کے لیے کیا رہ گیا تھا۔

صرف سانس رکنے سے ہی آدمی نہیں مرتا۔ اس کی آرزوؤں اور نیکیوں کو کچل دیا جائے تو وہ موت سے پہلے مرجاتا ہے۔

جیسے وہ مرگئی تھی۔

اس نے جلدی سے آنسو پونچھ کر نواز صاحب کو فرہاد کی خاندانی شرافت کا مکمل یقین دلانا چاہا۔

مگر بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ جا چکے تھے۔

☆==========☆==========☆

پھول کا چہرہ شبنم سے دھلتا ہے لیکن شبنم کا چہرہ آنسوؤں سے دھل رہا تھا۔ اس تکیہ سے اور بستر کی ایک ایک شکن سے اسے فرہاد کا پیار تڑپا رہا تھا۔

عزت اپنی تمام آرزوئیں' مسرتیں اور برسوں کے خواب نواز صاحب کے دفتر میں چھوڑ آئی تھی۔

جب انسان تمام مسرتوں سے خالی ہو جائے تو پھر وہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ یوں تو کاغذ کے پھول کی طرح حسین اور دلکش ہوتا ہے لیکن خوشبو سے خالی ہوتا ہے۔ عزت بھی اوپر سے بالکل ٹھیک تھی مگر اندر سے بیمار ہو گئی تھی۔

ماں نے اسے دیکھا تو بیٹی میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی اپنی اداسی پر قابو پا لیا تھا مگر چہرے کی پژمردگی چھپی نہ رہ سکی۔

"کہاں گئی تھی بیٹا! کچھ تھکی ہوئی سی نظر آ رہی ہو۔ چھٹی کے دن تو گھر میں رہا کرو۔"

وہ نڈھال سی ہو کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ "ہم کمانے والیوں کو چھٹیوں کے دن بھی چھٹی نہیں ہوتی۔ زندگی میں اتنی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں کہ انہیں سمیٹتے سمیٹتے صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے۔"

"میری بات چھوڑیئے امی۔ یہ بتایئے کہ کل شبنم بھابھی کے ہاں کس وقت چلیں گے؟"

"شام کے وقت جانا مناسب ہو گا۔"

اس کی والدہ پلنگ کے سرے پر آ کر بیٹھ گئیں اور آہستگی سے بولیں۔ "منگنی تو ہو ہی جائے گی۔ میرے بیٹے نے میرے لئے بہو پسند کی ہے میں اس کی خوشی کے لیے دنیا والوں کی پرواہ نہیں کرتی مگر بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ یہ شادی ذرا دیر سے ہو تو اچھا ہے۔"

"کیوں.... جب منگنی ہو جائے تو پھر شادی کے لیے دیر کیوں کی جائے؟"

ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی آ گئی۔ "عزت.... میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ انسان اپنی خوشی کے لیے دنیا والوں کی پرواہ نہیں کرتا مگر جب بہن بیٹی کا

مسئلہ سامنے آ جائے تو دنیا والوں کی خاطر وہ اپنی خوشیوں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔

"تم خود ہی سوچو۔ شبنم بہو بن کر آئے گی تو تمہارا رشتہ مانگنے والے بہو کو دیکھ کر الٹے پاؤں واپس چلے جائیں گے۔ اسی لئے میں چاہتی ہوں کہ پہلے تمہاری شادی ہو جائے' تم یہاں سے دلہن بن کر رخصت ہو جاؤ پھر میں شبنم کو یہاں لے آؤں گی۔"

بات قاعدے کی تھی۔ اصولاً یہی ہونا چاہیئے تھا۔ عزت نے کروٹ بدل کر ماں سے اپنا منہ چھپا لیا اور کہا۔ "میں شادی نہیں کروں گی۔"

"سبھی لڑکیاں یہی کہتی ہیں۔ کیا ہم تمہیں یوں ہی بٹھائے رکھیں گے اور دنیا والوں کے طعنے سنیں گے؟

"فرہاد آج صبح کہہ رہا تھا کہ اس نے تمہارے لیے کوئی اچھا سا لڑکا دیکھا ہے۔ آج شام کو وہ ان کے ہاں جائے گا۔ اللہ کرے کہ کچھ بات بن جائے۔ میں پانچ فقیروں کو کھانا کھلاؤں گی۔"

عزت نے آہستگی سے تکیہ کو کھینچ کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے کے نیچے رکھ لیا۔ وہ شادی کے لیے زبان سے انکار کر سکتی تھی' دل سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ دل کی دھڑکتی ہوئی دیوانگی کو روکنے کے لیے اس وقت تکیہ کا ہی سہارا ملا تھا۔

اس کی امی اسے چور نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ بوڑھی تھیں' تجربہ کار تھیں' انہوں نے سمجھ لیا کہ شادی کے نام پر چنگاری پھوٹ پڑی ہے۔ اب یہ چنگاری آپ ہی شعلہ بنے گی۔ اسے چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

عزت آنکھیں بند کئے خوابوں میں گم ہو گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ فرہاد انگوٹھی لے کر نواز صاحب کے ہاں گیا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں اور ان کے درمیان وہ انگوٹھی رکھی ہوئی ہے۔

نواز صاحب کہتے ہیں کہ وہ انگوٹھی محبت کا تحفہ ہے۔ ان کی محبت کا راز کھل جاتا ہے۔ منگنی کے لیے بات آگے بڑھتی ہے پھر نواز صاحب کی عزت اور خاندانی وقار کا سوال آتا ہے۔ اس سوال کے سامنے شبنم' ایک مجرمہ کی طرح آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

اور.... اور اس کے بھائی جان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ شبنم کی

زندگی سنواریں یا اپنی بہن کا مستقبل۔

بھائی آخر بھائی ہوتا ہے۔ بہن کا مستقبل برباد نہیں کر سکتا۔ وہ بہن کی خاطر شبنم سے شادی کرنے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن وہ ندامت سے شبنم کو منہ نہیں دکھا سکتے۔ اس لئے گھر آکر زہر کھا لیتے ہیں۔

عزت ہڑبڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

کیسا ظالم خواب تھا۔ کیا وہ نواز صاحب کی شریک حیات بننے کے لیے اپنے بھائی کی موت گوارا کر سکتی ہے۔

نہیں.... کبھی نہیں۔

دل نے کہا۔ "مگر یہ تو خواب تھا۔ فرہاد بھلا زہر کیوں کھانے لگا؟"

زہر کھانا تو کوئی کمال نہیں ہے۔ زہریلی زندگی گزارنا کمال ہے۔ بھائی جان کی زندگی میں کتنی تلخیاں پیدا ہو جائیں گی۔ شبنم سے کئے ہوئے وعدے پورے نہ ہوں گے۔ وہ ندامت سے آنکھیں نہیں ملا سکیں گے اور ہو سکتا ہے... ہو سکتا ہے کہ حالات شبنم کو پھر تباہی کے راستے پر لے جائیں۔

وہ بستر سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو چار بجنے والے تھے۔ ابھی شاید بھائی جان نواز صاحب کے ہاں نہیں گئے ہوں گے۔ ابھی وہ شبنم بھابھی کے ہاں مل سکتے ہیں۔ میں انہیں نواز صاحب کے ہاں جانے سے روک دوں گی۔ بات بڑھنے سے بہتر ہے کہ اس بات تک پہنچنے کا راستہ ہی مسدود کر دیا جائے۔

وہ جلدی سے غسل خانہ میں گئی اور منہ ہاتھ دھو کر تولیہ سے منہ پونچھتی ہوئی اپنی والدہ کے پاس آ گئی۔

انہوں نے کہا۔ "چولہے کے پاس روٹی رکھی ہے۔ سالن گرم کر کے کھا لو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں شبنم بھابھی کے ہاں جا رہی ہوں۔"

"یہ بھی کوئی جانے کا موقع ہے۔ بھوکی سو گئیں اور بھوکی جا رہی ہو۔"

"وہاں کھا لوں گی۔ ذرا جا کر دیکھوں گی کہ بھائی جان نے میری بھابھی کے لیے کیسا مکان لیا ہے۔ مکان ولنگٹن اسٹریٹ میں ہے نا؟"

"ہاں!"

"مکان کا نمبر کیا بتایا تھا؟"

"سات سو سات۔ گرلز اسکول کے ٹھیک سامنے...."

وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور بکھرے بالوں کو کنگھی سے درست کرنے لگی۔

☆============☆============☆

پھول کا چہرہ شبنم سے دھلتا ہے لیکن اس شبنم کا چہرہ آنسوؤں سے دھل رہا تھا۔

وہ بستر پر منہ اوندھائے پڑی تھی۔ اس تکیہ سے اور بستر کی ایک ایک شکن سے فرہاد کا پیار ٹپک رہا تھا۔ ابھی ابھی تو وہ گیا تھا ابھی ابھی تو محبت کے پھول کھلے تھے اور اب دیکھتے ہی دیکھتے پھولوں کی یہ سیج آتش نمرود بن گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد آنسو تھمنے لگے۔ سنجیدگی سے کوئی اہم فیصلہ کرنے کا وقت آ گیا۔

فیصلہ یہ کہ وہ عزت کی خوشیوں کو دیکھے یا اپنے ارمانوں کو؟

اگر وہ ذرا دیر کے لیے خود غرض بن جائے اور نواز صاحب کی مخالفتوں کے باوجود فرہاد سے شادی کر لے تو کوئی اس کا کیا بگاڑے گا؟

کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ عزت اگر نواز صاحب سے منسوب نہیں ہو گی تو کسی ایرے غیرے سے منسوب ہو جائے گی۔ شبنم کو کیا غرض تھی کہ اپنے سوا کسی دوسرے کے متعلق سوچے؟

لیکن وہ خود غرض نہیں تھی۔

وہ جس گھر میں بہو بن کر جانے والی تھی۔ اس گھر کی خوشیوں کو برباد نہیں کر سکتی تھی۔ ایک خوشگوار گھریلو زندگی گزارنے کے لیے اپنی سسرال کے ہر فرد کی مسرتوں اور نیک نامیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

وہ فرہاد کے ماحول میں پھول کھلا سکتی ہے' کانٹے نہیں بکھیر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ اسے فرہاد سے دور بہت دور چلے جانا چاہئے۔

آنسو پھر ابل پڑے۔

اس نے اتنا بڑا گھر بسایا تھا۔ سمندر کے کنارے ریت کا گھروندا نہیں بنایا تھا کہ ایک ٹھوکر سے توڑ دیا جاتا اور اس کے ٹوٹنے کا افسوس نہ ہوتا۔ یہاں تو اس کا گھر نہیں' دل ٹوٹ رہا تھا۔ حالات اس کا مضحکہ اڑا رہے تھے کہ کوا ہنس کی چال چل رہا تھا۔ ایک بدکار

عورت نیکی اور پاکبازی کی طرف مائل ہو تو اسے نفس کی چال چلنا ہی کہتے ہیں اور اس کا انجام یہی ہوتا ہے جو شبنم کا ہو رہا تھا۔

اپنی نادانی پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسو بھی تھے' آہیں بھی تھیں اور ایسی کراہیں بھی تھیں جو دل کے زخم سے ناسور کی طرح رستی ہیں۔

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔

وہ اسی طرح بستر پر پڑی رہی۔ ابھی فرہاد کے آنے کی توقع نہیں تھی۔ نہ جانے کون دستک دے رہا تھا۔ اٹھنے کو اس کا جی نہ چاہا۔

دوسری بار دستک ہوئی اور اس کے ساتھ آواز آئی۔ "بھائی جان۔"

کسی عورت کی آواز تھی۔ عزت سے روبرو بیٹھ کر باتیں کرنے کا کبھی موقعہ نہیں ملا تھا۔ اس لئے وہ آواز سے اسے نہ پہچان سکی۔ پھر بھی کوئی عورت آئی تھی' اسے دروازے پر [illegible] چاہئے تھا۔

وہ بستر سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر دیکھا تو گھبرا سی گئی۔

دروازے پر عزت کھڑی ہوئی تھی۔

اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اللہ! عزت باجی اس کی روئی ہوئی آنکھیں دیکھیں گی تو کیا سوچیں گی؟

وہ جلدی سے دوڑتی ہوئی غسل خانہ میں گئی اور اپنے منہ پر اور آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

دروازے پر پھر دستک ہونے لگی۔

وہ تولئے سے منہ پونچھتی ہوئی بھاگی بھاگی آئی اور دروازے کو کھول دیا۔

"آداب باجی!"

عزت اندر آ کر اس کے گلے لگ گئی۔

"میری اچھی بھابھی۔ ہم پہلی بار مل رہی ہیں نا۔ آپ بھائی جان سے ملتی ہیں ہم سے نہیں ملتیں۔ بھلا کیوں؟"

شبنم کا دل محبت سے بھر گیا۔ عزت کی باتوں میں اور اس کے گلے لگنے میں کتنی

اپنائیت تھی۔ وہ اسے بھابھی کہہ رہی تھی۔ اپنے خاندان کا ایک اہم رشتہ اسے دے رہی تھی۔

"آپ کے بھائی جان سے کتنی بار میں نے کہا کہ آپ سے ملنا چاہتی ہوں مگر وہ ٹال دیتے ہیں۔"

"بھائی جان کہاں ہیں؟" وہ اس سے الگ ہو کر بولی۔

الگ ہوتے ہی شبنم کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے پانی کے چھینٹے مار کر آنسوؤں کو چھپا لیا تھا لیکن آنکھوں کی ماتمی کیفیت کو نہ چھپا سکی تھی۔

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "بھابھی.... آپ رو رہی تھیں؟"

"نن.... نہیں تو۔ میں بھلا کیوں روؤں گی۔ آیئے تشریف رکھئے۔"

وہ نظریں چرا کر کرسیوں کی جانب بڑھنے لگی۔ عزت اسے گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "کیا بھائی جان نے آپ سے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ ہاں آپ کی نسبت کے لیے کہہ رہے تھے کہ آپ نواز صاحب سے منسوب ہونے والی ہیں۔ سچ کہتی ہوں باجی مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔"

عزت اس کی خوشی کے پیچھے اس کی روتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ کس طرح وہ بات کا رخ موڑ کر نواز صاحب کا تذکرہ چھیڑ رہی ہے۔

وہ آہستگی سے بولی۔ "میں نواز صاحب سے منسوب نہیں ہونا چاہتی۔"

شبنم نے چونک کر اسے حیرانی سے دیکھا۔

"ہاں بھابھی! میں اسی لئے بھائی جان سے ملنے آئی ہوں۔ ان سے کہنے آئی ہوں کہ ابھی رشتہ کی بات آگے نہ بڑھائیں' میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"مگر کیوں باجی! نواز صاحب اتنے اچھے ہیں۔ آپ ان کے دفتر میں کام کرتی ہیں۔ وہ آپ کے دیکھے بھالے ہیں۔ انہوں نے آپ کی رضامندی دیکھی ہو گی۔ جبھی تو وہ آپ کے بھائی جان سے ملنے آئے تھے۔"

عزت نے چونک کر پوچھا۔ "ملنے آئے تھے۔ کہاں ملنے آئے تھے؟"

شبنم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے نہیں کہنا چاہئے تھا کہ وہ یہاں آئے تھے۔ اب

وہ عزت سے کیسے کہے گی کہ وہ یہاں آ کر دل توڑنے والی باتیں کر رہے تھے۔ نواز صاحب عزت کے باس تھے' اس کے آئیڈیل تھے اور اس کی زندگی کے مالک بننے والے تھے۔ ہر حال میں ان کا احترام لازمی تھا۔ وہ نواز صاحب کے خلاف کوئی شکایت کر کے ان لوگوں کے درمیان تلخیاں نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی۔

اس نے کہا۔ "وہ.... باجی.... یہاں مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہوں نے آپ کے بھائی جان کا پوچھا تھا۔ وہ گھر میں نہیں تھے۔ اس لئے نواز صاحب زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ فوراً ہی چلے گئے۔"

"آپ سے انہوں نے کیا باتیں کیں؟"

"مجھ سے ... مجھ سے بھلا کیا باتیں کریں گے۔ وہ تو مجھے نہیں جانتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔"

شبنم کا جھوٹ پکڑا گیا۔ عزت جانتی تھی کہ نواز صاحب شبنم کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔

اس نے کہا۔ "بھابھی! آپ مجھ سے جھوٹ کہہ رہی ہیں۔ نواز صاحب آپ کو جانتے ہیں۔ انہوں نے آپ سے ضرور باتیں کی ہوں گی۔ لیکن آپ چھپا رہی ہیں۔"

شبنم اپنے جھوٹ میں الجھ کر رہ گئی۔

"میں سچ کہتی ہوں باجی۔ ان سے میری کوئی بات نہیں ہوئی...."

عزت نے کہا۔ "ہوں' جب وہ آپ کو نہیں جانتے ہیں تو وہ یہاں کیسے آ گئے؟ انہوں نے کیسے سمجھ لیا کہ بھائی جان سے آپ کے ہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔

"بھابھی! میں کوئی نادان بچی نہیں ہوں۔ آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ وہ یہاں آئے تھے۔ انہوں نے آپ سے صرف باتیں نہیں کیں بلکہ رُلا کر بھی گئے ہیں۔

"آپ مجھ سے حقیقت چھپانا چاہتی ہیں تو چھپایئے۔ میں ابھی جا کر نواز صاحب سے فیصلہ کرتی ہوں۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ یہاں آ کر آپ کے دل کو ٹھیس پہنچائیں۔ آپ ہمارے گھر کی عزت ہیں۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے گھریلو معاملات میں دخل اندازی کریں۔ میں ابھی جا کر ان سے دو ٹوک بات کروں گی۔"

وہ غصہ سے طنطناتی ہوئی جانے لگی۔

شبنم دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی اور اس کا بازو تھام کر بولی۔

"باجی' رک جایئے۔ نواز صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ لڑکیوں کو ایسے رشتے بڑی مشکلوں سے ملتے ہیں۔ آپ آپس میں تلخیاں مت پیدا کیجئے۔ آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے...."

"بھابھی جو ہم مزاج نہ ہو' ہم خیال نہ ہو میں اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ میں مر سکتی ہوں لیکن فیصلہ نہیں بدل سکتی۔"

وہ ایک جھٹکے سے بازو چھڑا کر دروازے کے باہر چلی گئی۔

اس نے اتنے پُراعتماد اور مستحکم لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا کہ شبنم اسے روک نہ سکی۔ چپ چاپ کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

اللہ.... یہ بھائی بہن مجھے کتنا چاہتے ہیں؟

میری زندگی سنوارنے کا کتنا بے لوث جذبہ ہے ان کے دل میں؟

ایک کنواری لڑکی کا سب سے بڑا سرمایہ اس کے سنہرے خوابوں کی تعبیر ہے اور عزت اپنی تعبیر کو پا کر بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہے۔

ٹھیک ہے کہ وہ نواز صاحب سے منسوب نہیں ہوگی لیکن نواز صاحب کے بعد پھر کبھی اس کے لیے دوسرا رشتہ آئے گا تو کیا وہ شبنم کے وجود پر اعتراض نہیں کریں گے؟ ضرور اعتراض کریں گے۔ جب تک وہ ان کے خاندان میں رہے گی' عزت نیک نامی سے بیاہی نہیں جا سکے گی۔

نہیں۔ وہ ایک کنواری لڑکی کے ارمانوں کو آگ لگا کر اپنے ارمانوں کو روشن نہیں کر سکتی۔ اس سے پہلے کہ ان کے اور نواز صاحب کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کوئی سنگین صورت اختیار کریں اسے خود ہی فرہاد سے رشتہ توڑ لینا چاہیے۔

اس کی آنکھوں میں بہت دیر کے ٹھہرے ہوئے آنسو آ گئے۔ وہ دروازے کے پاس سے پلٹ گئی اور ساڑھی کے آنچل سے آنکھیں پونچھتی ہوئی بیڈ روم کی طرف جانے لگی۔

☆===========☆===========☆

یہ کیسی دنیا ہے جو دوسرے کے عیبوں پر کیچڑ اچھالتی ہے اور اپنے عیبوں کو گلے لگا کر اسے ساری دنیا سے چھپانے کا فیصلہ کرلیتی ہے۔

فرہاد تھوڑی دیر تک ڈرائنگ روم کے قیمتی ساز و سامان اور ان کی آرائش کو دیکھتا رہا۔ فش ایکوریم کے نیلے پانی میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ پاؤں تلے دبیز اور ملائم قالین بچھے ہوئے تھے۔ صوفے اتنے آرام دہ تھے کہ بیٹھتے وقت کسی کی نرم آغوش کا گمان ہوتا تھا۔

ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھنے والے یا تو احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے تھے یا پھر ایسے ہی خوبصورت گھر کی تمنا کرتے تھے۔ فرہاد کے دل میں بھی تمنا پیدا ہوئی کہ اس کی بہن یہاں دلہن بن کر آئے اس بے چاری نے اپنی زندگی میں بڑی جدوجہد کی ہے۔ بھائی بے روزگار تھا تو تنہا کہانیاں لکھ لکھ کر گھر کے تمام اخراجات پورے کرتی رہی تھی۔ اس کہانی لکھنے والی بہن کو ایک ایسے ہی آرام دہ گھر کی ضرورت تھی۔

نواز صاحب اپنے کمرے سے نکل کر زینے طے کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے اور مسکرا کر بڑی خوش اخلاقی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ ”فرہاد صاحب! آج کیسے راستہ بھول گئے۔ بھئی کبھی کبھی ہم غریبوں کے ہاں بھی آجایا کریں۔“

فرہاد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اگر غریبوں کے مکانات اتنے شاندار ہوتے ہیں تو میں بھی غریب ہی رہنے کی دعا مانگوں گا۔“

نواز صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”بھئی دنیا داری کے لیے بعض اوقات گھر کو بھی دکان کی طرح سجا کر رکھنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے کاروباری اور اعلیٰ خاندان کے لوگ ملنے آتے ہیں۔ جہاں چار لوگوں میں عزت ہو، وہاں بہت ہی سنبھل سنبھل کر تعلقات بحال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ ذرا سی غلطی سے نیک نامی پر دھبہ لگ جاتا ہے۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

فرہاد نے کہا۔ ”آپ درست کہتے ہیں۔ اس دنیا میں نیک نامی کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ ذرا سی غلطی سے بدنامیاں گھر کا راستہ دیکھ لیتی ہیں۔ کل آپ غلطی سے

اپنی انگوٹھی عزت کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ عزت اسے گھر لے آئی۔ اس نے سوچا تھا کہ دفتر کھلے گا تو آپ کو واپس کر دے گی۔ اس کی نیت میں خلوص تھا لیکن کوئی دوسرا اس انگوٹھی کو عزت کے پاس دیکھ لیتا تو کتنی بدنامی ہوتی؟ اسی لئے میں نے دفتر کھلنے کا انتظار نہیں کیا سوچا کہ ابھی جا کر آپ کو دے آؤں۔"

اس نے جیب سے انگوٹھی نکال کر ان کی جانب بڑھا دی۔

نواز صاحب نے خاموشی سے اس انگوٹھی کو لے لیا۔ انگوٹھی میں چمک نہیں تھی جتنی کہ ان کی آنکھوں میں پیار کی چمک تھی۔ لمحہ بھر کے لیے ان کے سامنے عزت آ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ فرہاد کی موجودگی سے محتاط ہو کر خیالوں کی دنیا سے باہر آ گئے۔

انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "فرہاد صاحب! واقعی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ انگوٹھی اِدھر اُدھر پھینکی نہیں جاتی۔ بلکہ سلیقہ سے پیش کی جاتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے گھر آ کر کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

فرہاد ان کی باتوں کا مقصد سمجھ گیا۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ "میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔ آپ جب چاہیں آ سکتے ہیں۔"

اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ ایک ملازم ٹرالی میں چائے اور دیگر لوازمات لے کر آ رہا تھا۔ وہ ٹرالی ان کے درمیان رکھ کر باہر جانے لگا۔

نواز صاحب کو اس وقت کسی کا آنا ناگوار گزر رہا تھا۔ انہوں نے ملازم سے کہا۔ "میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ کہہ دینا کہ صاحب گھر میں نہیں ہیں۔"

پھر انہوں نے مسکرا کر فرہاد سے کہا۔ "بڑی مشکل ہے۔ چھٹی والے دن بھی یہ ملنے والے اتنی فرصت نہیں دیتے کہ گھریلو معاملات میں دلچسپی لی جائے۔"

انہوں نے مٹھائی کی ایک ڈش فرہاد کی طرف بڑھائی۔

"شکریہ! میں صرف چائے پیوں گا۔"

"پھر بھی۔ کچھ تو لیجئے۔"

اس نے مجبوراً مٹھائی کا ایک چھوٹا سا پیس اٹھا لیا۔ اتنے میں دروازے سے ملازم کی آواز آئی۔

"آیئے۔ تشریف لایئے۔"

نواز صاحب جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے دروازے کا پردہ ہٹا کر عزت آ رہی تھی۔ فرہاد نے اسے دیکھتے ہی حیرت سے پوچھا۔ "تم.... تم کیسے آ گئیں؟"

عزت نے نواز صاحب کو دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "بھائی جان! مجھے ایک اخبار میں اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ میں یہاں استعفیٰ دینے آئی ہوں۔"

نواز صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ مرجھا گیا۔ انہوں نے کہا۔ "تم.... تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں.... میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا' تم ایسا فیصلہ کرو گی۔"

فرہاد کو بھی اس کا یہ احمقانہ فیصلہ برا لگا۔ ابھی اس کا مستقبل سنوارنے کے لیے کتنی اچھی باتوں کا آغاز ہوا تھا اور وہ احمق لڑکی اپنی ہی خوشیوں کو برباد کرنے یہاں چلی آئی تھی۔ اس نے کہا۔ "عزت! اچھی بھلی ملازمت کو چھوڑنا دانشمندی نہیں ہے۔ نواز صاحب تمہاری قدر کرتے ہیں۔ اگر تمہیں کوئی شکایت ہے تو کہو۔ میں بھی یہاں موجود ہوں۔ شکایت دور کرنے کے لیے میں بھی نواز صاحب سے سفارش کروں گا۔"

عزت نے جواب دیا۔ "مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔ میں خود کو ماہنامہ "عزت" کے قابل نہیں سمجھتی اس لئے استعفیٰ دینا چاہتی ہوں۔"

نواز صاحب خاموش کھڑے تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ عزت اپنی ملازمت سے نہیں بلکہ محبت سے استعفیٰ دینے آئی ہے۔

فرہاد کو کچھ احساس ہوا کہ عزت کو نواز صاحب سے کوئی شکایت ہے اور بڑی اہم شکایت ہے۔ ورنہ وہ ایسے وقت نہ آتی۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ بھائی اس کے رشتے کے لیے نواز صاحب کو کریدنے آیا ہے؟ وہ جانتی تھی۔ جان بوجھ کر ایسے وقت آئی تھی۔ اسے نواز صاحب کی حمایت کرنا چاہئے تھا۔ وہ رسالے کی آڑ میں مخالفت کر رہی تھی۔

وہ تعلیم یافتہ تھی۔ اقرار و انکار کے اظہار کا سلیقہ جانتی تھی۔ کیا وہ اشارتاً ملازمت سے انکار کر کے نواز صاحب کے رشتے سے انکار کر رہی تھی؟

وہ خود کو ماہنامہ "عزت" کے قابل نہیں سمجھتی یا نواز صاحب کے قابل نہیں سمجھتی؟

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مٹھائی پلیٹ میں رکھ دی اور کہا۔ "عزت' کیا تمہیں نواز صاحب سے شکایت نہیں ہے؟ سوچ سمجھ کر جواب دو۔"

وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچانے لگی۔

”ہمارے درمیان نظریات کا اختلاف ہے۔ زندگی کی جو تلخ کہانیاں میں پسند کرتی ہوں‘ وہ انہیں پسند نہیں آتیں۔ ان کا خیال ہے کہ کہانی کا کوئی کردار اگر غلط راستے پر چل رہا ہے تو اس کے لیے نیکی کے دروازے نہیں کھولنے چاہئیں۔“

”یہ کچھ غلط کہہ رہی ہیں۔“ نواز صاحب نے کہا۔ ”میرے کہنے کا انداز کچھ اور تھا۔ میں نے کہا تھا کہ ایک بدکار عورت کو شریف خاندانوں میں پناہ نہیں دینی چاہئے۔ اگر انہیں پناہ دی جائے تو دوسری عورتوں کا حوصلہ بڑھے گا۔ وہ بھی گناہ آلود زندگی گزاریں گی اور پھر کسی شریف خاندان میں پناہ لینے آجائیں گی۔ دوسروں کی عبرت کے لیے گناہ گار کو سزا دینا ضروری ہے۔“

فرہاد اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ساری باتیں اس کی سمجھ میں آگئی تھیں۔ اس نے نواز صاحب سے کہا۔ ”میں آپ کے خیال سے متفق ہوں کہ گناہگار کو سزا ملنی چاہیے۔ لیکن وہ گناہ کی زندگی بہت پہلے ہی چھوڑ چکی ہو تو پھر اسے کس جرم کی سزا دی جائے؟“

عزت نے کہا۔ ”بھائی جان! میں ہر پہلو سے بحث کر چکی ہوں۔ ان کا ایک ہی جواب ہے کہ ایک عورت کے لیے برسوں کی جدوجہد سے حاصل کی ہوئی عزت اور شہرت پر دھبہ نہیں لگایا جا سکتا۔“

فرہاد کا سر جھک گیا۔

وہ سر شبنم کی وجہ سے نہیں جھکا تھا۔ بہن کے رشتے کی وجہ سے جھکا تھا۔ وہ دنیا والوں کے سامنے بڑی بڑی مدلل تقریریں کر سکتا تھا۔ لیکن بہن کے سسرال والوں کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔

شبنم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کی خاطر بڑی آزمائشوں سے گزرنا ہو گا۔ بہتر ہے کہ پہلے عزت باجی کی شادی ہو جائے پھر ہم اپنے متعلق سوچیں گے۔

لیکن شبنم سے تو اس کی شادی پہلے ہو‘ یا بعد میں۔ فرق کیا پڑتا ہے۔ دل سے تو رشتے ہو ہی چکے تھے۔ وہ شبنم کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ نہ شبنم کو چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی بہن کی زندگی برباد کر سکتا تھا۔

عزت نے کہا۔ ”بھائی جان! مجھے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ میں فیصلہ کر

چکی ہوں‘ آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔“

”نہیں عزت! فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔ ہر پہلو پر غور کرنا پڑتا ہے۔ ہر اچھائی برائی پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ فیصلہ ایسا کرنا ہو گا کہ شبنم کا بھی دل نہ ٹوٹے اور نواز صاحب کی عزت پر بھی حرف نہ آئے۔“

عزت اور نواز صاحب دونوں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ فرہاد نے کہا۔ ”میں شبنم کو لے کر اس شہر سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ نواز صاحب سے شبنم کا کوئی دور کا بھی رشتہ ہے۔“

عزت نے کہا۔ ”میں اس فیصلے کو تسلیم نہیں کرتی۔ آپ کوئی جرم نہیں کر رہے ہیں کہ یہاں سے منہ چھپا کر کہیں دور چلے جائیں۔“

نواز صاحب نے کہا۔ ”فرہاد صاحب ایک ایسا فیصلہ کر رہے ہیں کہ میری بات بھی رہ جاتی ہے اور ان کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے لیکن تم خواہ مخواہ ضد کر رہی ہو۔ ایک اچھے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہی ہو۔“

”میں اس لئے انکار کر رہی ہوں کہ نیکی چھپ کر نہیں کی جاتی۔ شبنم بھابھی کو گلے لگا کر ہم نیکی کی مثال پیش کریں گے تو دوسرے بھی سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ عورت ہو یا مرد‘ غلطی ہر ایک سے ہوتی ہے۔ کبھی جان بوجھ کر اور کبھی بے حد مجبوری کی بناء پر۔ لیکن کبھی ان کا ضمیر بھی جاگتا ہے۔ وہ پوری سچائی اور ایمانداری سے توبہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے وقت ان کے لیے توبہ کے دروازے کھلنے چاہئیں۔

”نواز صاحب! میں قلمکار ہوں اور آپ ناشر ہیں۔ میں ستم رسیدہ لوگوں پر کہانیاں لکھتی ہوں اور آپ ان کہانیوں کو شائع کرتے ہیں۔ اگر ان ستم رسیدہ لوگوں سے ہماری ہمدردی صرف لکھنے پڑھنے کی حد تک ہے تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہم اپنے رسالوں کی کہانیوں میں بڑے روشن خیال مبلغ اور معاشرے کی اصلاح کرنے والے نظر آتے ہیں لیکن حقیقی زندگی میں اپنی عزت اور ناموس کی سفید چادر اوڑھ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتے ہیں کہ کہیں اس سفیدی پر دھبہ نہ لگ جائے۔

”بہرحال میں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ آپ کے ساتھ ٹھوس دلائل سے بھی بحث کرنے کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ خواہ مخواہ آپ کا بھی وقت ضائع ہوتا ہے اور ہمارا بھی۔

چلئے بھائی جان!"

وہ دروازے کی طرف جانے کے لیے پلٹ گئی لیکن وہ آگے نہ بڑھ سکی۔ دروازے پر شبنم کھڑی ہوئی تھی۔

"بھابھی.... آپ؟"

"شبنم' تم یہاں کیسے آگئیں؟" فرہاد نے پوچھا۔

شبنم کی آنکھیں آنسوؤں سے دھل کر کنول کی پنکھڑیوں کی طرح صاف اور اجلی ہو گئی تھیں۔ اب ان میں آنسوؤں کی کمزوری نہیں تھی بلکہ اپنے آخری فیصلہ کا عزم و استقلال تھا۔ اس نے ماتھے پر بل ڈال کر فرہاد سے کہا۔ "آپ میری کار لے کر یہاں چلے آئے۔ آپ کو احساس ہونا چاہئے کہ کار کے بغیر مجھے کہیں آنے جانے میں کتنی دشواری پیش آ سکتی ہے۔ بزنس پارٹنر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ میری ضرورت کی چیزوں کو بغیر اجازت استعمال کرنے لگیں۔"

اس کے لہجے میں ایسا روکھاپن اور بیگانگی تھی کہ عزت اور فرہاد اسے حیرانی سے تکنے لگے۔

فرہاد نے ذرا سختی سے کہا۔ "شبنم یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

"دماغ میرا نہیں آپ کا خراب ہوا ہے۔ لائیے کار کی چابی دیجئے اور آئندہ اس بات کا خیال رکھئے کہ ہم صرف بزنس پارٹنر ہیں۔ اس کے آگے اگر آپ کسی اور رشتے کی توقع کرتے ہیں تو یہ آپ کی نادانی ہے۔"

نواز صاحب پرسکون کھڑے ہوئے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ اس لئے پرسکون اور مطمئن ہو گئے تھے کہ شبنم ان کے الجھے ہوئے مسائل کا حل پیش کر رہی تھی اور فرہاد سے کسی طرح کا بھی رشتہ قائم کرنے سے انکار کر رہی تھی۔

عزت نے کہا۔ "بھابھی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ بھائی جان کی توہین کر رہی ہیں؟"

شبنم نے اس کی طرف پلٹ کر کہا۔ "عزت صاحبہ! آپ مجھے کس رشتے سے بھابھی کہہ رہی ہیں۔ کیا آپ کے بھائی سے میری شادی ہو گئی ہے؟"

عزت سٹپٹا کر رہ گئی۔ شبنم کے موجودہ رویئے کے پیش نظر وہ شادی سے پہلے اسے بھابھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

شبنم نے تلخ لہجے میں کہا۔ "عزت صاحبہ! آپ کے بھائی جان سے تو کیا' میری شادی کسی سے نہیں ہو سکتی اور نہ ہی میں ایسے سنہرے خواب دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ لوگوں نے میرے متعلق کوئی ایسا خواب دیکھا ہے تو اسے بھول جائیے۔"

فرہاد اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "شبنم! کیا تم عزت کی خاطر مجھ سے منسوب ہونے سے انکار کر رہی ہو؟"

عزت نے کہا۔ "ہاں بھائی جان! یہی بات ہے۔ بھابھی کو معلوم ہو چکا ہے کہ نواز صاحب انہیں...."

شبنم نے جلدی سے چیخ کر کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ نواز صاحب کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی آپ لوگوں کے متعلق کچھ جاننا سمجھنا چاہتی ہوں۔ میری کار کی چابی دیجئے...."

فرہاد نے کہا۔ "چابی نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ واپس جاؤ گی۔ یہاں جو ڈرامہ تم کھیلنے آئی ہو۔ اسے میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں اور تمہاری سمجھ میں نہیں آیا ہے تو اچھی طرح سن لو۔ میں نے دنیا والوں سے چھپ کر تمہیں اپنانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ میں نواز صاحب کے سامنے بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ تم میری ہو اور ہمیشہ میری عزت بن کر رہو گی۔"

شبنم کمزور پڑ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ "نہیں نہیں... آپ مجھے بھول جائیے۔ مجھے چھوڑ دیجئے۔ ورنہ عزت باجی کے لیے کسی شریف گھرانے سے رشتہ نہیں آئے گا۔"

عزت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بھیگی آنکھوں سے نواز صاحب کو دیکھا تو انہوں نے سر کو جھکا لیا۔ انہیں ندامت سی ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شبنم کبھی بری تھی' اب بری نہیں ہے۔ اس کے آنسو' اس کا عزم' عزت کے لیے قربانی دینے کا جذبہ اور فرہاد کا اس پر بھرپور اعتماد.... یہ سب باتیں ظاہر کر رہی تھیں کہ اب شبنم میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شریف خاتون کی طرح گھریلو زندگی گزا

سکتی ہے۔

نواز صاحب اس کے کردار کی خوبیوں کو تسلیم کر رہے تھے لیکن وہی ایک بات آڑے آتی تھی کہ برکت علی جیسے لوگ طعنے دیں گے تو ان کی گردن شرم سے جھک جائے گی۔

وہ صوفہ پر بیٹھ گئے اور دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر سوچنے لگے۔

عزت سر جھکائے کھڑی تھی۔ شبنم منہ چھپائے رو رہی تھی۔ فرہاد نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”آنسو پونچھ لو۔ جس فیصلے میں سچائی ہوتی ہے' وہ کبھی نہیں بدلتے۔ آؤ' ہم واپس چلیں۔ چلو عزت....“

وہ تینوں واپس جانے لگے۔

نواز صاحب نے کہا۔ ”ٹھہر جائیے۔ جانے سے پہلے میری بھی کچھ سنتے جائیے۔

”فرہاد صاحب! سچ بات تو یہ ہے کہ میں شبنم سے نفرت نہیں کرتا۔ کوئی بھی پڑھا لکھا' سمجھدار آدمی شبنم کے نیک ارادوں کو دیکھ کر اس کی قدر کرے گا اور اسے اچھی زندگی گزارنے کے بہترین مواقع دے گا۔

”میں بھی شبنم کی قدر کرتا ہوں۔ بخدا مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

”شکایت مجھے اپنے آپ سے ہے کہ مجھ میں وہ حوصلہ کیوں نہیں پیدا ہو رہا ہے جو آپ لوگوں میں ہے۔

”میری نیک نامی' میری عزت اور شہرت نے مجھے کمزور بنا دیا ہے۔ اتنا کمزور بنا دیا ہے کہ میں نیک مقاصد کے لیے بھی دنیا والوں سے نہیں لڑ سکتا۔ آخر کیوں؟ آپ جیسا حوصلہ مجھ میں کیوں نہیں ہے؟ آپ لوگ بھی عزت دار ہیں' لیکن اپنی عزت خطرے میں ڈال کر پوری دیانتداری سے شبنم کے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں اور میں ہوں کہ ایک سچائی سے کترا رہا ہوں۔“

عزت کے دل میں خوشی کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ اگرچہ وہ اب بھی اپنی عزت اور نیک نامی کے خیال سے بہت محتاط تھے لیکن وہ اس حد تک سوچنے لگے تھے کہ شبنم کو اچھی زندگی گزارنے کے بہترین مواقع ملنے چاہئیں۔

فرہاد نے ان کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”واقعی یہ سوچنے کی بات ہے کہ

آپ ہماری طرح پورے حوصلہ سے ایک نیک مقصد کے لیے کیوں نہیں لڑ سکتے۔ میرا خیال ہے نواز صاحب کہ جب تک کسی سے گہری محبت اور وابستگی نہیں ہوتی' اس وقت تک اس کی خاطر قربانی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ شبنم سے آپ کی گہری وابستگی نہیں ہے لیکن کسی دوسرے کے لیے ضرور ہوگی۔ پہلے آپ اپنے دل کو ٹٹول کو دیکھئے۔ اگر آپ کسی کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں تو اس کے متعلق یہ سوچئے کہ آپ اس کے لیے کیسی کیسی آزمائشوں سے گزر سکتے ہیں؟“

نواز صاحب کی نظریں بے اختیار عزت کی طرف اٹھ گئیں۔ ہاں' گہری وابستگی ہے۔ یہی وہ جان آرزو ہے جس کے لیے میں آزمائشوں سے گزرنے کا حوصلہ کر رہا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ کسی کے لیے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ ہو' کسی سے خون کا رشتہ ہو یا کسی سے دل کا رشتہ ہو' تب ہی اس کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

نواز صاحب کی سوچ کچھ کمزور تھی مگر یہ کیا کم تھا کہ رفتہ رفتہ ان میں حوصلہ پیدا ہو رہا تھا۔

ذرا دیر کے لیے وہ سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ مسلسل عزت کو دیکھے جا رہے ہیں اور وہ بھائی کی موجودگی میں جھجکتی ہوئی اپنے آپ میں سمٹی جا رہی ہے۔

وہ بھی جھینپ گئے۔ انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ ”فرہاد صاحب! آپ درست کہتے ہیں۔ گہری وابستگی ضروری ہے۔ انسان اسی کے لیے سوچتا ہے اور کچھ کر گزرتا ہے' جس سے اس کا خون کا رشتہ ہو یا.... یا پھر دل کا رشتہ ہو۔ میں اپنے دل سے مجبور ہو کر....“

ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ باتوں کے دوران کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے گھور کر دروازے کی جانب دیکھا۔ ان کے والد سلیم احمد سبزی کی ٹوکری اٹھائے بازار سے آ رہے تھے اور اب ڈرائنگ روم سے گزر کر کچن کی طرف جانا چاہتے تھے۔

آنے والے کو سب ہی نے دیکھا۔ شبنم نے بھی دیکھا پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ چہرہ خوب جانا پہچانا تھا۔ کبھی وہ چہرہ جوان تھا۔ مگر اب اس پر بڑھاپے کی پرچھائیاں تھیں۔

جوانی سے بڑھاپے تک عمر بدلتی ہے۔ چہرہ نہیں بدلتا۔ اس نے باپ کے چہرے کو

پہچان لیا۔

سلیم احمد بھی ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ جب انہوں نے بیٹی کو آخری بار دیکھا تھا۔ اس وقت وہ چودہ برس کی تھی۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ وہ پہلے دبلی پتلی سی تھی اب صحت مند نظر آ رہی تھی۔ ذرا سا فرق پیدا ہوا تھا۔ پہلے وہ نوجوان تھی' اب جوان ہو گئی تھی لیکن چہرہ وہی تھا۔

سلیم احمد کے ہاتھ سے سبزی کی ٹوکری چھوٹ گئی۔ وہ تڑپ کر بیٹی کی طرف بڑھے۔

"میری بچی!"

شبنم بھی ان کی جانب بڑھی۔

باپ نے محبت سے گلے لگانا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی بیٹی نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

اور چیخ کر بولی۔

"ابا.... !تم زندہ ہو.... ؟کیوں زندہ ہو.... ؟تم مر کیوں نہ گئے.... ؟میری ماں پر ظلم کرنے والے قصائی.... تم نے اسے گھر سے بے گھر کر دیا۔ مجھے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ اب کیا بیٹی کی بربادی کا تماشہ دیکھنے کے لیے زندہ ہو۔"

عزت اور فرہاد شدید حیرانی سے دیدے پھیلائے شبنم کو دیکھ رہے تھے۔

اور نواز صاحب کے ذہن میں تو آندھیاں چلنے لگی تھیں یہ اچھی طرح واضح ہو چکا تھا کہ شبنم ان کی گمشدہ بہن ہے پھر بھی انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے طور سے سوچ رکھا تھا کہ ان کی بہن کسی اچھے گھرانے میں خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہوگی۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جس سے وہ نفرت کر رہے تھے' جسے وہ اپنے شریف سماج میں قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ وہ ان کی اپنی ہی بہن ہے۔

سلیم احمد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور شبنم انہیں پاگلوں کی طرح جھنجھوڑتی جا رہی تھی۔

"تماشہ ہی دیکھنے کے لیے زندہ ہو تو دیکھو۔ اب میں کسی شریف خاندان کی بیٹی یا کسی

عزت دار آدمی کی بہن نہیں بن سکتی۔"

نواز صاحب یوں تڑپ گئے جیسے منہ پر زبردست طمانچہ پڑا ہو۔

"میں کسی کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں کسی کی بہن نہیں ہوں۔ میں کسی کی شریک حیات بننا چاہتی ہوں تو اس گھر کی جوان لڑکی پر میرا منحوس سایہ پڑ جاتا ہے۔ میں شرافت کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں تو میرے ماضی کی سیاہی میرے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔

"شرابی.... تم یہاں کیوں آئے ہو؟ کہاں سے بھٹک کر آ گئے ہو.... آ ہی گئے ہو تو نواز صاحب کو بتاؤ کہ میں ماں کے پیٹ سے کسی کی داشتہ بن کر پیدا نہیں ہوئی تھی۔"

فرہاد نے آگے بڑھ کر سلیم احمد کے گریبان کو اس کے ہاتھوں سے چھڑا دیا اور اسے سمجھانے لگا۔ "شبنم ہوش میں آؤ۔ اس طرح نہ چیخو۔ یہ تمہارے والد ہیں۔ ان کی عزت کرو۔ غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ پچھلی باتوں کو دہرانے سے غلطیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ انہیں بھول جانا ہی بہتر ہے۔"

عزت نے قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بھابھی! آپ کے ابا کی جھکی ہوئی گردن اور بہتے ہوئے آنسو بتا رہے ہیں کہ وہ اپنی غلطیوں پر نادم ہیں۔ آپ نے جو کچھ بھی کہا انہوں نے ایک مجرم کی طرح سر جھکا کر خاموشی سے سن لیا جسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے اسے معاف کر دیا جاتا ہے بھابھی۔"

شبنم اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

سلیم احمد دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپائے سسک رہے تھے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر نواز صاحب کی جانب دیکھا۔

وہ گم صم کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور چہرے کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ خاموش تھے اور سوچ رہے تھے کہ اتنی اونچی شاندار کوٹھی کی دیواریں اب تک کس طرح کھڑی ہیں۔ یہ گر کیوں نہ گئیں۔

یہ شاندار کوٹھی ایک خوبصورت اشتہار تھی۔ اسے دیکھ کر نواز احمد درانی کی امارت اور شان و شوکت تسلیم کی جاتی ہے۔

صرف کوٹھی شاندار نہیں تھی۔ نواز صاحب کی شخصیت بھی دیدہ زیب تھی۔ اس شخصیت کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کے پیچھے ماضی میں ایک تباہ حال گھرانے کی

عبرت ناک داستان چھپی ہوئی ہے۔

ان کی پھیلی ہوئی آنکھیں شبنم پر مرکوز تھیں۔ یہ وہی دودھ پیتی بچی تھی جسے انہوں نے بارہا اپنی گود میں کھلایا تھا۔ دودھ کی نہر بہہ رہی تھی۔ اس دودھ کی نہر سے دونوں ہی بہن بھائی سیراب ہوتے رہے تھے۔

ماں نے دونوں کو کبھی پیاسا نہیں رکھا لیکن بھائی نادانستگی میں بہن کو پیاسا مارتا رہا۔ وہ پیار کے ایک ایک قطرے کے لیے بھٹکتی رہی لیکن انسانوں کے اس سمندر سے اسے شبنم کا ایک قطرہ بھی نہ ملا۔

اور جب فرہاد نے اپنے عمل کے تیشہ سے اس کے لیے ایک نہر کھود دی تو وہ خود اپنی بہن کے راستے میں دیوار بن گئے۔

سلیم احمد نے روتے اور جھجکتے ہوئے کہا۔ "بیٹا نواز' میں شرابی ہوں۔ گناہگار ہوں۔ ایک مجرم کی زبان سے بیٹی کو بیٹی نہیں کہہ سکتا۔ تم ہی اسے بہن کہہ کر گلے لگالو۔"

شبنم نے قدرے تلخی سے کہا۔ "ابا! آپ کتنی اونچی ہستی کو اپنا بیٹا کہہ رہے ہیں' آپ کتنے عظیم انسان سے التجا کر رہے ہیں کہ وہ مجھ جیسی ذلیل عورت کو بہن بنا کر گلے سے لگائیں۔ آپ ہوش میں تو ہیں؟"

"بیٹی! میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔ یہ نواز میرا بیٹا ہے۔ تمہارا سگا بھائی ہے۔ میں اسے التجا نہیں کروں گا تو اور کس سے کروں گا؟"

"بھائی؟" شبنم نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "یہ.... یہ میرے بھائی ہیں؟"

فرہاد بھی غیریقینی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ اسے اپنے کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بوڑھا شخص نواز صاحب کو شبنم کا سگا بھائی کہہ رہا ہے۔

عزت آرا بھی ایک ٹک اپنے محبوب کو' اپنے آئیڈیل کو دیکھ رہی تھی' وہ جن کے اُجلے دامن میں تل برابر سیاہی کا دھبہ نہ تھا۔ انہیں ٹھکرائی ہوئی عورت کا بھائی کہا جا رہا تھا۔

کہنے سے کیا ہوتا ہے؟

کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ سلیم احمد سچ کہہ رہے ہوں۔

سچ تو اس وقت مانا جائے گا جب نواز صاحب اپنی زبان سے اعتراف کریں گے۔

اور نواز صاحب نظریں چرا رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ عزت انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی ہے لیکن اس کی نظریں نشتر بن کر ان کے دماغ میں چبھ رہی ہیں۔

مارے ندامت کے وہ کٹے جا رہے تھے۔

وہ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے تھے لیکن اتنی تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا اور اس عورت کو بہن کہنا جس پر وہ کیچڑ اچھالتے رہے تھے۔ یہ کتنا مشکل مرحلہ تھا۔ نہ اقرار کر سکتے تھے نہ انکار کر سکتے تھے اور نہ ہی منہ چھپا کر فرار کا راستہ تلاش کر سکتے تھے۔

وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑے ہوئے تھے پھر آہستہ آہستہ ڈگمگاتے ہوئے زینے کی طرف جانے لگے۔

"نواز صاحب!" فرہاد نے آواز دی۔ "یہ.... یہ شبنم کے متعلق کیا کہہ رہے ہیں؟.. .. کیا یہ سچ ہے؟"

نواز صاحب کے قدم چند لمحات کے لیے زینے پر رکے۔ پھر وہ بلندی کی طرف جانے لگے۔

بلندی.... جس پر انہیں کبھی بڑا ناز تھا۔

بلندی.... جسے پا کر انسان اپنی پستی بھول جاتا ہے۔ اس طرح بھولتا ہے کہ بہن کا چہرہ بھی دھندلا جاتا ہے۔

وہ درمیانی زینے پر پہنچ گئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں عزت آراء نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا۔ انہیں اس شاہانہ ڈرائنگ روم میں اتنے اونچے مقام پر دیکھ کر وہ ان کی شخصیت سے متاثر ہو گئی تھی۔

وہ آج بھی متاثر تھی لیکن شخصیت کے اس آئینہ میں ذرا سا بال پڑ گیا تھا۔ یہ بری بات ہے کہ وہ سچائی کو تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ ان سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ منہ چھپا کر پھر بلندی کی طرف جا رہے تھے۔

بلندی پر جانا اچھی بات ہے لیکن تنہا کیوں؟ اپنے ساتھ بہن کو بھی کیوں نہیں لے جاتے؟

یہ کیسی خود غرضی ہے؟

کیا عزت اور شہرت کے خیال سے اور سماج کے ڈر سے وہ اپنے ہی خون کے رشتے سے انکار کر سکتے ہیں؟

نہیں.... انکار نہیں کر سکتے تھے البتہ اقرار کرنے کے لیے ذرا سے حوصلے کی ضرورت تھی۔

وہ زینے کی انتہائی بلندی پر پہنچ رہے تھے۔ اسی وقت شبنم نے کہا۔ "ابا! تم مجھے کسی کی بہن بنا کر میری عزت بڑھانا چاہتے ہو لیکن کسی کو میرا بھائی بنا کر اس کی توہین کر رہے ہو۔ کیونکہ بعض اوقات کچھ لوگوں کے لیے بھائی کا لفظ ایک گالی بن جاتا ہے۔

"لیکن مجھ جیسی عورت کے لیے جو آج تک خود کو یتیم سمجھتی رہی' یہ بھائی کا رشتہ سب سے زیادہ اہم اور مقدس ہے۔

"شاید دنیا والوں کے سامنے میں اس مقدس رشتے کو زبان پر نہ لا سکوں لیکن یہاں تنہائی میں ایک بار تو بھائی جان کہہ سکتی ہوں۔

"بھائی جان!"

بہن کی آواز میں ایسا درد تھا کہ نواز صاحب کا سارا وجود لرزنے لگا۔ قدم ڈگمگا گئے اور وہ زینے پر سے لڑھکنے لگے۔

شبنم اور عزت کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔ فرہاد اور سلیم احمد دوڑتے ہوئے زینے پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے پھر انہیں درمیان کے زینے پر ہی روک لیا۔

وہ بری طرح زخمی ہونے سے بچ گئے تھے۔ شاید ہڈیوں میں چوٹ آئی ہو۔ بظاہر پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

شبنم اور عزت بھی ان کے قریب پہنچ گئیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔

"نواز صاحب!"

فرہاد نے انہیں آواز دی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سلیم احمد نے پوچھا۔ "بیٹے! تم اوپر کیوں جا رہے تھے' کیا میری بات بری لگی ہے؟"

انہوں نے آہستگی سے کہا۔ "نہیں' میں بلندی پر جا رہا تھا۔ پستی میں آنے کے لیے۔ کیونکہ پستی میں آئے بغیر انسان اپنے سے چھوٹوں کا دکھ درد نہیں سمجھ سکتا۔

"ماں نے جو دودھ بہایا اس بہتی ہوئی دودھ کی نہر کے آگے میں اپنی عزت اور نیک نامی کے بند نہیں باندھ سکتا۔ کیونکہ دودھ اور خون کے رشتے کے سامنے دنیا کی ہر چیز کمزور پڑ جاتی ہے۔ یہاں کوئی فلسفہ کام نہیں آتا۔ تمام نظریات پھیکے پڑ جاتے ہیں اور سماج میں رہنے کے طریقے یہاں سے بدل جاتے ہیں۔

"یہاں سے ذلت کا احساس اور بدنامیوں کا خوف مٹ جاتا ہے اور سماج کے بوڑھے قانون سے لڑنے کا ایک نیا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

"فرہاد صاحب نے ٹھیک کہا تھا کہ جب تک کسی سے گہری محبت اور وابستگی نہیں ہوتی' اس وقت تک اس کی خاطر قربانی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

"یہ سچ ہے انسان اسی کے لیے سوچتا ہے اور کچھ کر گزرتا ہے۔ جس سے اس کا دل کا رشتہ ہوتا ہے یا خون کا رشتہ ہوتا ہے۔

"اور شبنم سے میرا خون کا رشتہ ہے۔

"یہ میری برسوں کی بچھڑی ہوئی بہن ہے...."

یہ کہہ کر انہوں نے شبنم کے دونوں بازوؤں کو تھام لیا۔

شبنم کچھ حیران تھی' کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ قسمت کی اس ستم ظریفی پر کچھ یقین آ رہا تھا اور کچھ بے یقینی بھی تھی۔

دونوں بہن بھائی چند لمحوں تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پرانے رشتے کی پہچان کرتے رہے۔ پھر نواز صاحب نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

شبنم بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

عزت کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

اس نے بھیگی آنکھوں سے نواز صاحب کو دیکھا۔ ابھی ان سے بہت سی شکایتیں تھیں کہ.... کیوں.... اب شبنم کو گلے کیوں لگا رہے ہیں؟ یہ کیسی خود غرضی ہے؟ اب جو [illegible] شبنم کے لیے پیدا ہوا' وہ پہلے کیوں نہ پیدا ہوا؟

یہ کیسی دنیا ہے۔ دوسرے کے عیبوں پر کیچڑ اچھالتی ہے اور اپنے عیبوں کو گلے لگا کر اسے ساری دنیا سے چھپانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

فرہاد آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور عزت کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"عزت! جب تک اپنا ہاتھ نہیں جلتا اس وقت تک انسان دوسروں کی جلن کو نہیں سمجھتا۔

"آج نواز صاحب جل گئے ہیں۔

"اس جلن کی جان لیوا تکلیف انہیں ہمیشہ یاد رہے گی۔

"اب وہ صرف اپنے لئے نہیں' دوسروں کے لیے بھی درد محسوس کریں گے۔ اب تم بھی نواز صاحب سے صلح کر لو۔ یہ کیا کم ہے کہ ان کی عزت اور نیک نامی کی کمزور دیواریں ٹوٹ گئی ہیں۔"

عزت کی آنکھوں میں آنسو مسکرانے لگے۔ اس نے آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں دیکھا۔ نواز صاحب' شبنم کو سینے سے لگائے اس کے آنسو پونچھ رہے تھے۔ نہیں صرف آنسو نہیں پونچھ رہے تھے' سماج کے چہرے پر جمی ہوئی گرد صاف کر رہے تھے۔

☆===========☆===========☆